مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی

کتابی آئینہ میں

المعروف بہ

گاندھی جیون

مہاتما گاندھی کی ابتدائی زندگی یعنی بچپن سے آج تک کے تمام چھوٹے بڑے واقعات
اور زندگی کے ہر عیب و خوبی کی بالکل سچی تصویر

مرتبہ

حضرت مولانا ظفر نیازی مدظلہ

باخذ حقوق دائمی

کامیاب بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی نے شائع کیا

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

اردو میں پہلی بار | دسمبر ۱۹۳۸ء | قیمت عہ مجلد

میں اپنے اس تاریخی مجموعے کو ملک کے اُن بہادر سپاہیوں کے
نام منسوب کرتا ہوں جن کے دل مذہبی تعصب سے ہمیشہ پاک
رہے ہیں اور جن کے قلب کی گہرائیوں میں آزادی کا حسین
پودا آہستہ آہستہ پرورش پا رہا ہے اور جو ملک کو غلامی کی
زنجیروں سے آزاد کراتے ہوئے ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت کو
راحت سمجھکر برداشت کرتے ہیں اور ہندو مسلم اتفاق و اتحاد کو
حصول آزادی کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔

مخلص

ظفر نیازی

دہلی۔ دسمبر ۱۹۳۸ء

فہرست مضامین

۷۸۶

ہندوستانی مورخوں میں عام طور پر یہ مرض پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ جب وہ کوئی تاریخ یا کسی مشہور آدمی کی سوانح عمری لکھتے ہیں تو تصویر کا صرف ایک ہی رخ زیادہ روشن کرتے ہیں یعنی اصل واقعات میں سے برائیاں نظر انداز کر دی جاتی ہیں اور صرف تعریفوں کا پہلو مد نظر رہتا ہے۔ ممکن ہے لکھنے والے بعض اوقات نادانستہ اس خلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہوں۔ لیکن عام رائے میں ان کا یہ فعل دانستہ شمار ہوتا ہے بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ایسا کرنے میں لکھنے والے کی غرض شامل ہوتی ہے۔

کسی ملک کی تاریخ یا کسی شخص کی سوانح عمری اسی وقت مکمل اور ایماندارانہ کہی جا سکتی ہے جب لکھنے والا نڈر ہو کر اور ہر برائی بھلائی کو اپنا فرض سمجھ کر بیان کر دے اور کسی کی ناراضگی یا نقصان کی قطعی پروا نہ کرے۔ ورنہ بہتر ہے کہ وہ بجائے تاریخ نویسی کے افسانہ نویسی شروع کر دے جس میں اپنی طرف سے کافی رنگ آمیزی کی جا سکتی ہے اور اس طرح قلم کے جوہر آسانی سے پیش کر کے جادو نگاری اور ہمدردی اور وفاداری کے بے شمار سارٹیفکیٹ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

تاریخ نویسی میں بعض اوقات مذہبی تعصب اور رنگ کا فرق بھی اثر انداز ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک انصاف اور فن تاریخ نویسی کا تعلق ہے اس قسم کی لغزش بے ایمانی کی زد میں آتی ہے۔ تاریخ لکھنے والے کو امتیازات کی دنیا سے بالاتر ہونا ضروری ہے اُسے ہرگز یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ جو واقعات وہ قلم بند کر رہا ہے انکا تعلق کسی کالے سے ہے یا گورے سے۔ امیر سے ہے یا غریب سے۔ بادشاہ سے ہے یا گداسے۔ ہندو سے ہے یا مسلمان سے؟۔ تاریخ نویسی اس تعصب سے قطعی علیحدہ چیز ہے۔ اس میں نہ کوئی قصداً جھوٹا امتیاز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ کسی مذہبی تعصب کی گنجائش ہے۔ جن لکھنے والوں نے ایسا کیا ہے۔ میرے خیال میں یا تو وہ فن تاریخ نویسی سے واقف ہی نہیں اور یا کسی غرض کے ماتحت انہوں نے اپنے ہیرو کو خوش کرنے کی نااہلانہ اور بدنام کن کوشش کی ہے۔ اور یہ فنِ تاریخ پر ایک ایسا ناتجربہ کارانہ دھبہ ہے جس پر انصاف کو ہمیشہ اعتراض رہے گا

مجھے تاریخ کے مطالعہ کا ہمیشہ شوق رہا ہے اور جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوائے چند مستند کتابوں کے ہندوستانی مورخوں نے اکثر یہی لغزش کی ہے۔ یہاں تک کہ تعلیمی زندگی میں میں نے جو تاریخ کی کتابیں پڑھیں اور جو نصاب میں داخل تھیں ان میں بھی کہیں کہیں یہی جھلک نظر آئی کہیں کالے گورے کا فرق دیکھا اور کہیں مذہبی تعصب کا۔ لیکن تعجب ہے کہ آج تک اس اہم خطا پر نہ نصاب مقرر کرنے والوں نے کوئی بازپرس کی اور نہ پڑھنے والے کوئی اصلاحی قدم اٹھا سکے۔ گو اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ ہندوستانی تعلیم میں تاریخ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور اکثر اُسے توڑ مروڑ کر پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال اس سے زیادہ اہمیت حاصل نہ کر سکا کہ کسی مجلس میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے اظہار خیال کر لیا جاتے۔

ہندوستانی مورخوں کی یہی لغزش اپنے مشاہیر کی سوانح نویسی میں پائی

جاتی ہے۔ مثلاً ہندوؤں کے مشہور لیڈر گاندہی جی کی سوانحمریاں اکثر لوگوں نے لکہیں اور بعض اوقات تو بہت ہی تفصیل کے ساتھ شائع ہوئیں لیکن افسوس ہے کہ لکھنے والوں نے آزاد خیالی کے اظہار میں کسی قدر بخل سے کام لیا ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ انسانی زندگی عیوب سے پاک ہوتی ہے اور آج کونسا انسان ہے جس نے اپنی زندگی میں کوئی عیب ہی نہیں کیا۔ بالکل یہی حال مسٹر گاندہی کا ہے ان کی زندگی میں اُن سے لغزشیں بہی ہوتی ہیں۔ انہوں نے قصداً گناہ بھی کئے ہیں اُن سے نادانستگی میں خطائیں بھی سرزد ہوتی ہیں لیکن واقعات لکھنے والوں نے یا تو قصداً ان کی خطائیں اور عیب لکھنے سے درگذر کی یا ان لوگوں کی معلومات ہی محض پوچھ گچھ کی حد تک محدود تھی۔ کہ زندگی کے خوبصورت واقعات کونمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کرکے اس مجموعہ کا نام سوانح عمری رکھ دیا۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو عموماً اظہار عیب بھی پڑہنے والوں کے لئے مفید ہوتا ہے اور اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس نوعیت کا عیب تھا اور اُس کو کس طرح چھوڑا گیا اور انسانی زندگی اس سے کس طرح اور کس طریقہ سے پاک کی گئی۔

مگر لکھنے والوں کا یہ حال ہے کہ لاہور سے ایک سوانح عمری شائع کی گئی تو مورخ صاحب نے طرز بیان وہ اختیار کیا کہ گویا کوئی مرید اپنے پیرو مرشد کے حالات لکھ رہا ہے۔ اور حالات کا یہ عالم کہ اُن میں سوائے خوش عقیدگی کے اور جو کچھ بھی تھا وہ مبالغہ آمیز الفاظ میں اکثر صحیح واقعات تھے۔ مگر وہی واقعات جو بادی النظر میں ایک پیر مرشد کے ہونے چاہئیں یا جو زیادہ سے زیادہ ایک باادب مرید اپنے پیر کی مدح سرائی میں کہہ سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتابوں سے ملک کو اور پڑہنے والوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اور لطف یہ ہے کہ گاندہی جی بہی ایسی اوچھی طبیعت کے نہیں

ہیں کہ وہ اس غیر ضروری تعریف سے خوش ہوں، پھر اندازہ کیجئے کہ ایسے غیر مفید لٹریچر کو ملک میں بطور تاریخ کے پھیلانا کس حد تک ذمہ دارانہ فعل ہے۔

انسان کی فطرت میں شک کو بڑا دخل ہے۔ اور یہی جذبہ ہے جس نے فرشتوں کو انسان کی صحیح قیمت اور وزن کا اندازہ نہ ہونے دیا۔ لہٰذا ایسے شکّی کے سامنے کوئی ایسی بات بیان کرنا جس میں اُسے شک کی کوئی گنجائش نظر آتی ہو کبھی بھی موثر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہی ہوا کہ ایسی یک رخی کتابیں پڑھتے پڑھتے پڑھنے والوں نے سوچنا شروع کیا۔ قدرتاً اُن کی طبیعت میں ایک سوال کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

"کیا گاندھی جی میں کوئی عیب ہی نہیں"

ظاہر ہے کہ اس سوال کے مناسب اور بر وقت جواب نہ ملنے پر شکّی طبیعتوں نے کیا فیصلہ کیا ہوگا۔ مگر لکھنے والے کی بلا کو غرض ہے جو اس دور اندیشی اور ایسی سمجھ بوجھ سے کام لیتا۔ اُسے تو اظہار عقیدت کرنا تھی اور وہ کسی نہ کسی صورت ہوگئی۔ خواہ بدنام ہونے والا بدنام ہو یا برا سمجھا جائے۔ وہ اپنا فرض ادا کر چکا۔

گاندھی جی کی زندگی ہندوستانیوں کے لئے دنیاوی حیثیت سے ایک سبق ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عقیدت مندوں کی بے پناہ اور مہلک خوش عقیدگی نے اس اچھے اور کارآمد سبق میں بھی کانٹے بچھا دئے اور بجائے "غور و فکر" کی دعوت کے اس الجھن میں پھانس دیا کہ آخر گاندھی جی نے اپنی زندگی میں کوئی خطا بھی کی یا نہیں کیونکہ مکمل زندگی پڑھ لینے کے بعد بھی انکی کوئی لغزش سامنے نہ آسکی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح مورخ نے عیب پوشی کی ہے۔ ممکن ہے کچھ غلط بیانی سے تعریفی واقعات میں بھی کام لیا ہو۔ یہاں آکر ایک سبق آموز زندگی معمہ بن کے رہ جاتی ہے اور اس سے جو فائدہ پڑھنے والوں کو اٹھانا چاہئے تھا اس سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں۔

ایسی حالت میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسے لکھنے والوں نے بجائے قومی خدمت کے

قوم کو ایک فائدہ سے محروم کیا ہے۔ گو اس میں ان کا دانستہ قصور نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ قوم اور ملک کے سامنے مجرم ہیں کہ عقیدت کے جوش میں انہوں نے ایک اچھی چیز کو خوش عقیدگی کے رنگ میں گھول کر اصلیت سے دور کر دیا اور فائدہ اٹھا سکنے والی طبیعتیں ایک مفید اور مستقبل نواز سبق سے محروم رہ گئیں۔

انہی حالات کے پیش نظر اور عرصہ تک خوب غور کرنے کے بعد میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنے مقدور کے مطابق اس کمی کو پورا کردوں اور جس اہم فائدہ سے ملک کو نادانستہ محروم کیا گیا ہے۔ اگر ہو سکے تو اسے قوم و ملک کے سامنے پیش کروں۔

میں نے اس معاملہ میں جتنی چھان بین کی ہے اور واقعات کی تفصیل اور ثبوت کیلئے جتنے سفر کئے ہیں ان کا حال بیان کرنا یقیناً غیر ضروری ہے البتہ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کے تمام واقعات جو کچھ میں نے حاصل کئے ہیں ان پر میرا ایمان ہے کہ وہ یقیناً صحیح ہیں ان میں تعریفی واقعات بھی ہیں اور عیوب بھی۔ نہ میں نے تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور نہ عیب ظاہر کرنے میں کسی قسم کا خوف اور تعصب برتا ہے۔ اور بقول گاندھی جی کے کہ اپنا عیب چھپانا ضمیر کو ہلاک کرنا ہے مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ معلومات کے حصول میں مجھے جن لوگوں نے مدد دی وہ یقیناً گاندھی جی کی تعلیم (سچائی) پر پوری طرح عامل ہیں۔ جنہوں نے بڑی فراخ دلی سے میرے ساتھ تعاون کیا اور مجھے اصل واقعات کی تہہ تک پہنچنے میں ہر امکانی مدد دی۔ میں ان کانگریسی لیڈروں اور گاندھی جی کے احباب کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے میرے حاصل کردہ واقعات کی بڑی دلیری اور آزادی سے تصدیق کی۔ اور ہر قسم کے ثبوت مہیا کر دئے۔ تاکہ میں اپنے ایمانداری کے جذبہ میں ثابت قدمی کے ساتھ ملک کے سامنے ایک ایسی عملی زندگی پیش کرسکوں جس کے بھلے برے واقعات پر غور کرنے کے بعد ہر سمجھدار ہندوستانی اپنے لئے کوئی راہ عمل پیدا کرسکے۔

گو فی الحال میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں سمجھا جاؤں گا۔ لیکن یہ کتاب پڑھنے کے بعد ہر شخص کو ماننا پڑیگا کہ ہر ہندوستانی میں گاندھی بننے کی صلاحیت ہے۔ البتہ اُسے راہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی اندھے کو سیدھے راستہ ڈال دیا جائے تب بھی وہ منزل مقصود پر پہونچ جاتا ہے۔ چہ جائیکہ آنکھوں والے۔

کتاب کی تفصیلات پڑھنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ گاندھی جی ابتدا میں کیا تھے اور کون کہہ سکتا تھا کہ ایسا بچہ کسی دن کامیاب زندگی کا مالک ہو سکیگا مگر واقعات نے دکھایا کہ جس بچہ کے متعلق اس کے ماں باپ اچھی رائے نہ رکھتے ہوں اور وہ ذہن کا بھی بُرا ہو اور اچھے موقع سے فائدہ اٹھانے کی بھی اس میں اہلیت نہ ہو کیونکر ایک دن مہاتما بن جاتا ہے۔ مہاتما ہی نہیں بلکہ اپنے وطن اور قوم کی کشتی کا ناخدا بھی بنتا ہے اور ساری قوم اسے اپنا "سب کچھ" سمجھنے لگتی ہے بعض مذہبی بزدل اسے تقدیر کا کھیل بتائیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کی کامیابی بعض وقتی حالات کا نتیجہ ہے۔ اور اگر پڑھنے والے یقین کر سکیں تو اس میں اتنا اضافہ اور کردوں کہ وقتی حالات کے ساتھ ہی اس کامیابی کا دوسرا سبب گاندھی جی کی سچائی اور ضمیر پرستی ہی ہے جس نے انہیں اکثر موقعوں پر گمنامی اور تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچایا ہے۔

مجھے امید ہے کہ گاندھی جی کی زندگی کے واقعات ہندوستانیوں کے لئے دنیوی کامیابی میں یقیناً مدد دیں گے خصوصاً ایسے واقعات جو بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی لالچ کے بالکل اصلی رنگ میں پیش کئے گئے ہوں۔

آخر میں ایک بات پھر عرض کردوں کہ مجھے گاندھی جی سے نہ بے پناہ عقیدت ہے اور نہ جاہلانہ اختلاف۔ گو میں ان کی زندگی ایک سبق کی مانند سمجھتا ہوں۔ اور دنیاوی ترقیوں کے لئے مشعل کی مثال دے سکتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ

نہیں ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو اندھی تقلید کا مشورہ دوں۔ جانتا ہوں کہ گاندھی جی سے مجھے اور سب مسلمانوں کو اور دوسری قوموں کو مذہبی اختلاف ہے مگر وہ صرف عقائد کی حد تک۔ تعصب سے بہت دور۔ البتہ میں اُن کی دنیاوی زندگی کے بہت سے اہم حصوں کو قابل تقلید سمجھتا ہوں خصوصاً "سچائی" اور حق گوئی کے معاملہ میں گاندھی جی کا جذبہ اس قابل ہے کہ اُسے ضرور سراہا جائے۔ اور اس کی تقلید کی جائے۔ اسی طرح اُن کا جذبۂ وطن پرستی بھی قابل تقلید ہے۔ جس نے گاندھی جی کی سچی شہرت میں اہم امداد کی ہے۔ اس رسمی گزارش اور اظہار حقیقت کے بعد میں اُن ہستیوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہوں جن میں اچھے حالات اور اچھی چیزوں سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اور جو اپنی ترقیوں کے لئے راہ عمل معلوم کرنے کی ضرورت مند ہیں کہ وہ اس کتاب کو محض معلومات کے لئے ہی نہ پڑھیں بلکہ گاندھی کی زندگی کے جو بے شمار واقعات کتاب میں درج ہیں اُن پر ذرا غور کے ساتھ توجہ دیں اور سوچیں کہ ہر واقعہ گاندھی جی کی زندگی پر کس طرح اثرانداز ہؤا۔ اور اس نے گاندھی جی کو کیا نقصان یا نفع پہنچایا۔ مگر خیال رہے کہ اس غور و فکر میں تعصب کو رتی برابر بھی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کتاب کا مقصد گاندھی جی کی شہرت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لئے آپ کے سامنے آئی ہے کہ آپ موہن داس جیسے معمولی لڑکے کو مہاتما گاندھی بنتے ہوئے عالم خیال میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور آپ سمجھ سکیں کہ دنیا کی کامیابی کے لئے کن کوششوں کی اور کن باتوں کی ضرورت ہے۔ اور ان تمام اچھے بُرے واقعات پر پوری توجہ صرف کرنے کے بعد آپ بھی اپنے لئے کوئی اچھا راستہ تلاش کریں۔

آپ یقین کیجیے کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اگر چاہے تو خود مہاتما گاندھی بن سکتا ہے۔ اور ان کی طرح دنیاوی ترقیوں کی معراج حاصل کر سکتا ہے۔

مگر ضرورت ہے اس ترقی کی خواہش کی اور اس کے بعد امکانی کوششوں کی۔ اگر یہ دونو چیزیں پیدا ہو جائیں اور تلون شامل نہ ہو تو انسان یقیناً ایک بار نہیں بلکہ ہزار بار دہاتما بن سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے والے حضرات بھی اس کتاب کو اسی نیت اور خلوص کے ساتھ پڑھیں گے۔ جن کی موجودگی میں یہ کتاب معرض وجود میں آ رہی ہے۔

دہلی

یکم دسمبر ۱۹۳۸ء

مخلص

ظفر نیازی

گاندھی جیون

پنساری گاندھی

اس سے پہلے کہ آپ گاندہی جی کی زندگی کے حالات پڑھیں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ گاندہی جی ہیں کون؟ اور ان کے آباواجداد کون تھے۔ یہ باتیں جاننا اس لئے ضروری ہیں کہ کتاب ختم کرنے کے بعد آپ کو یہ اندازہ کرنا بھی ضروری ہوگا کہ جو شخص آج اتنی بڑی شخصیت کا مالک ہے اس کی ابتدا، کیا تھی اور وہ کن ماں باپ کا بیٹا اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی روشن ہو سکے گی کہ معمولی زندگی کو اعلےٰ مدارج تک پہونچانے میں کن کن باتوں اور کن اعمال کی ضرورت تھی جو مسٹر گاندہی یا ان کے خاندان کو پیش آئیں۔

کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں بنیوں کا ایک طبقہ گاندہی کہلاتا ہے۔ موجودہ گاندہی جی کا تعلق اسی فرقہ سے ہے۔ اس فرقہ کا خاندانی پیشہ پنساری کی دوکان تھی۔ کیرانہ کی تجارت نہ اس زمانہ میں حقیر سمجھی جاتی تھی نہ آج اسے ذلیل سمجھا جاتا ہے۔ البتہ دوسری تجارتوں کے مقابلہ میں اس کو کسی قدر کم درجہ حاصل تھا۔ تاہم گاندہی خاندان میں عام طور پر کیرانہ کی ہی تجارت ہوتی تھی۔ یہ لوگ بھی اور دوسرے تجارتی

شہروں سے تھوک کا بیوپار بھی کرتے تھے۔ اور گو مالی حالت کافی اچھی تھی لیکن ایک سیجھ بنئے کی طرح اس کے اظہار میں ہمیشہ کوتاہی برتی جاتی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر شادی بیاہ کے موقعوں پر دل کھول کر خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے خیال میں دولت کے اظہار اور خرچ کا کوئی دوسرا موقع ہی نہیں تھا۔ یہ دستور آج بھی عام طور پر ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً بنیوں میں کہ وہ شادی اور دوسری تقاریب پر توقع کے خلاف خوب جی کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں اور باقی زندگی عام طور پر سادگی سے بسر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو بادی النظر میں عیب کی طرح بُرا سمجھا جائے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ بھی ایک دور اندیشی ہے اور اسی عدم دور اندیشی نے ہندوستان کی بعض قوموں کو مفلس بنادیا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کو۔

کاٹھیاواڑ کا گاندھی خاندان اپنی دیانت اور معاملہ کی صفائی کے سبب مناسب شہرت رکھتا تھا۔ بعض اوقات امانت کے معاملہ میں بھی گاندھیوں نے شاندار مثالیں پیش کی ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر اچھے امین سمجھے جاتے تھے۔ اور مقامی لوگ ہی نہیں بلکہ دور والے بھی اپنی اہم امانتیں گاندھی خاندان کے افراد کے پاس رکھدیا کرتے تھے اور جہاں تک تحقیق و تلاش نے کام کیا مجھے کوئی ایسی مثال نہ مل سکی جس سے اس امین خاندان پر خیانت کا شبہ بھی کیا جا سکے۔ اسی دیانتداری کا نتیجہ تھا کہ گاندھی خاندان کی تجارت کو کبھی نقصان نہیں پہونچا۔

ان لوگوں میں تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔ صرف تجارتی حساب و کتاب اور معمولی نوشت و خواند کو یہ لوگ اپنی ضرورت کے لئے کافی سمجھ کر اس سے آگے بڑھنے کی کبھی کوشش نہ کرتے تھے۔ رسم پرستی اور مذہب نوازی میں بعض اوقات گاندھی خاندان نے اعتدال سے آگے بھی قدم بڑھا ہے۔ یہ لوگ چھوت چھات کے بہت سختی سے پابند

تھے۔ اور بعض دفعہ تو ان کے طرزِ عمل سے تافی تعصب کی بو آنے لگتی تھی۔ یہی حال ان کی مذہبی عبادت کا تھا۔ خاندان کا بچہ بچہ عبادت کا شوق رکھتا تھا۔ اور خاندان کے ہر فرد پر حویلی جانا (یعنی مندر کی حاضری) بہت ضروری اور اہم فرض سمجھا جاتا تھا گاندھی خاندان کو مذہبی اعتبار سے تو نہیں البتہ تجارتی دیانتداری کے اعتبار سے شہر میں ایک امتیاز حاصل تھا۔ اور اسی امتیاز کی بدولت یہ لوگ اکثر مقامی حکام تک رسائی رکھتے تھے۔ مگر یہ رسائی محض تجارتی اغراض کے ماتحت تھی۔ سیاست سے اس خاندان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

اسی دوران میں مہاتما گاندھی کے دادا سیٹھ اوتم چند عرف اوتا گاندھی نے ہوش سنبھالا۔ شروع شروع میں تو اوتا گاندھی کو اپنے آبائی پیشہ یعنی تجارت سے تھوڑا بہت لگاؤ رہا مگر رفتہ رفتہ اُن کی یہ دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ خاندانی روایات کے خلاف اوتا گاندھی میں حصولِ تعلیم کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ گو خاندان والوں کو ان کی یہ تلاش اور کوشش مضحکہ خیز اور غیر ضروری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن انہیں کیا خبر تھی کہ اوتا اپنے اس تعلیمی جنون کو ایک دن شاندار کامیابی کے ساتھ پیش کر دکھائے گا۔

یہ خاندان کاٹھیاواڑ کی مشہور ریاست پوربندر میں عرصہ دراز سے خاموش تجارتی زندگی گزار رہا تھا۔ اب سیٹھ اوتم چند گاندھی نے صرف اپنی ذات سے ایک انقلاب اور زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ وہ ریاست پوربندر میں دیوان مقرر ہو گئے۔ اس زمانہ میں دیوان کی کیا پوزیشن تھی۔ آج کل کے زمانہ میں ذرا مشکل ہی سے سمجھائی جا سکتی ہے۔ اُس وقت دیوان کو بہت کچھ اختیار حاصل تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے وہی ہوتا تھا۔ اگر اتفاق سے والی ریاست اور دیوان میں رشتۂ اعتبار قائم ہو جائے تو دیوان بجائے خود بادشاہی کیا کرتے تھے۔ یہی حال مسٹر اوتم چند کا تھا۔ وہ اپنے وقت کے بڑے خوددار دیوان تھے۔ یہاں تک کہ بعض

دفعہ اپنے مالک رانا صاحب پور بندر کو بھی جواب دے بیٹھتے تھے۔ مگر رانا ان کی انتظامی قابلیت کے مداح ہو چکے تھے۔ اس لئے ایسے ناز برداری کا ایک سلسلہ سمجھ کر خاموش ہو جایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ رانا صاحب کے بعد ان کی بیوی رانی صاحبہ سے کسی معاملہ میں مسٹر اوتا کو اختلاف ہوا۔ اور اس اختلاف نے نازک صورت اختیار کر لی۔ مسٹر اوتا بات کے پکے تھے اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس پر رانی کو بڑا طیش آیا اور انہوں نے ریاست کے دوسرے ذمہ دار اہلکاروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ مسٹر اوتا (یعنی اوتم چند) کو پتہ چل گیا کہ ان کے خلاف ایک گہری سازش کی جا رہی ہے جس میں یقیناً اُن کی عزت کو خطرہ ہے۔ یہ حالات دیکھ کر ایک دن وہ ریاست پور بندر سے چپ چاپ نکل کر سیدھے نواب صاحب جوناگڑھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نواب جوناگڑھ اوتم چند کی انتظامی قابلیت کا حال سنتے رہتے تھے۔ یکایک ان کے جوناگڑھ پہونچنے سے نواب صاحب کو خوشی ہوئی۔ غالباً نواب کا خیال ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا تھا۔

نواب سے پہلی ملاقات مسٹر اوتم چند گاندھی کی خود نواب صاحب کے محل میں ہوئی۔ جب اوتم چند نواب صاحب کے سامنے پہونچے تو بجائے شاہی آداب کے انہوں نے نواب صاحب کو الٹے ہاتھ سے سلام کیا۔ یہ بات نواب صاحب کو بہت ناگوار ہوئی اور وہ سمجھے کہ اوتم چند میں شاہی آداب و تہذیب کو برتنے کا مادہ نہیں ہے۔ چنانچہ نواب نے فوراً ہی سوال کیا۔

اوتم چند کیا آپ شاہی آداب سے بھی ناواقف ہیں مجھے تعجب ہے کہ آپ اتنے عرصہ تک پور بندر میں کس طرح نبھاتے رہے۔ یہ اُلٹے ہاتھ سے سلام کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اوتم چند گاندھی نے نہایت سنجیدگی سے یہ سب کچھ سنا اور عرض کی۔ بیشک حضور کا خیال صحیح ہے۔ میں نے شاہی آداب کے خلاف یہ حرکت کی ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ یہ سیدھا ہاتھ پور بندر والوں کی خدمات کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ گو انہوں نے میرے ساتھ بڑی ناانصافی اور ظلم کیا ہے۔ لیکن میں اپنے اصول کا پابند ہوں۔ اور یہ ہاتھ کسی دوسرے کے آداب اور اظہار وفاداری کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی آجکل کی طبیعت کا والی ریاست ہوتا تو فوراً ہی اپنی فرعونیت اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کرتا۔ اور عجب نہیں کہ اوتم چند کو ہمیشہ کے لئے جیل میں ڈالدیتا مگر نواب جوناگڑھ نے بہت توجہ سے سنا اور سن کر صرف اتنا کہا۔ "بات معقول ہے"

اوتم چند عرف اوتا گاندھی نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے چار لڑکے ہوئے اور اس کے بعد بیوی کا انتقال ہوگیا تو انہوں نے دوسری شادی کی جس سے دو لڑکے ہوئے۔ ان چھ بھائیوں میں آپس میں بے حد محبت تھی اور آخر تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان بھائیوں میں سوتیلے کون سے ہیں۔ سب سے چھوٹے لڑکے کا نام تلسی داس اوتم چند گاندھی تھا۔ یہ بعد میں ریاست پوربندر کے دیوان بھی ہو گئے تھے۔ ان سے بڑے لڑکے کا نام کرم چند اوتم چند گاندھی تھا۔

باپ کے حالات

یہی کرم چند عرف کبا گاندھی موجودہ گاندھی جی کے والد تھے۔ مسٹر کرم چند بھی عرصہ تک ریاست پوربندر میں دیوان رہے۔ اور بعد میں راجستانی[۲] عدالت کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ریاست وانکانیر اور راجکوٹ میں بھی

---

[۱] گجراتی علاقوں میں بیٹے کے نام کے ساتھ باپ کا نام بھی شامل کر دیا جاتا ہے [۲] ان دنوں یہ عدالت والیان ریاست کے باہمی اور خاندانی تنازعا کا فیصلہ کیا کرتی تھی۔ اب یہ عدالت ہی نہیں رہی۔

عرصہ دراز تک دیوان رہے۔ آخر میں ریاست راجکوٹ سے پنشن ہوئی تھی۔

مسٹر کرم چند گاندھی اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے اور ان کی مذہبی معلومات بھی عام خاندان والوں کی طرح مکمل یا زیادہ نہ تھی لیکن سیتے بہت تجربہ کار۔ ریاست کے کاموں میں وہ بالکل اسی طرح مشاق نظر آتے تھے جیسے کوئی اعلےٰ تعلیم یافتہ۔ ان کی تعلیمی لیاقت گجراتی کے تقریباً چوتھے پانچویں درجہ کی سی تھی۔ سیاسی حالات سے گو کسی قدر باخبر تھے لیکن تاریخ کے معاملہ میں ان کی ناواقفیت ضرورت سے زیادہ تھی۔ طبیعت میں قدرتی نیاضی تھی۔ عام خاندان والوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ ایسا تھا کہ لوگ آج تک انہیں یاد کرتے ہیں۔ اسی فیاضی کا نتیجہ تھا کہ مرنے کے بعد انہوں نے اولاد کے لئے بہت ہی کم جائداد ترکہ میں چھوڑی۔ حالانکہ انہوں نے اپنی زندگی میں کافی دولت پیدا کی تھی۔ لیکن خراج بے حد تھے۔ جمع کرنے کا شوق کبھی نہ ہوا۔

تقدیر نے انہیں عورت کے معاملہ میں بہت دکھ پہنچایا۔ یکے بعد دیگرے ان کی تین بیویوں کا انتقال ہو گیا۔ تب انہوں نے تقریباً پینتالیس سال کی عمر میں چوتھی شادی کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر کرم چند کو بڑھاپے میں بھی عورت کا شوق تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے اولاد کے لئے چوتھی شادی کی تھی۔ مگر یہ کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ گزشتہ بیویوں سے ان کی دو لڑکیاں موجود تھیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو عالم ضعیفی کی چوتھی شادی اور وہ بھی اولاد کی موجودگی میں عام پسند بات نہ تھی۔ چوتھی بیوی سے چار اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ ان چاروں میں گاندھی جی سب سے چھوٹے ہیں۔

ماں کے حالات

مسٹر کرم چند کی چوتھی بیوی یعنی گاندھی جی کی والدہ بہت ہی نیک عورت

تھیں۔ سمجھداری اور دانشمندی میں بھی وہ اپنے خاندان کی اکثر عورتوں میں ممتاز سمجھی جاتی تھیں۔ یہی حال مذہبی عقائد کا تھا۔ کبھی بیماری وغیرہ کے زمانہ میں بھی اُن کی وہ پوجا پاٹ بند نہ ہوسکی جس پر انکا روزانہ عمل تھا۔ عورتیں عموماً مذہبی معاملات میں زیادہ چست ہوتی ہیں لیکن یہ خاتون تو اس سے بھی زیادہ عابد اور پرہیزگار تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس نیکی کا اثر ان کی تربیت میں بھی شامل ہوگا اور انہوں نے اپنی اولاد کو کیسی تربیت دی ہوگی۔ ان خاتون کے متعلق ایک بات ابتک گاندھی خاندان میں مشہور ہے کہ وہ ہر قسم کی برائی سن سکتی ہیں۔ نقصان اٹھانا گوارا کرلیتی تھیں لیکن جب کوئی انہیں گفتگو کے دوران میں جھوٹا کہہ دیتا تھا تو اس سے ہمیشہ کیلئے تعلق منقطع کردیتی تھیں۔ اُن کا قول تھا کہ دنیا میں آدمی ہر قسم کے پاپ کرسکتا ہے۔ لیکن جھوٹ نہیں بول سکتا۔ چنانچہ تحقیقات سے اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسی کوئی مثال نہیں چھوڑی جس پر ان کے خلاف کبھی دروغ گوئی کا الزام لگ سکا ہو۔ موجودہ گاندھی میں جو حق گوئی کا جذبہ پایا جاتا ہے یہ یقیناً انہیں اپنی والدہ سے میراث میں ملا ہے۔ اور اسی تربیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ان کا فرزند بھی جھوٹ کو دنیا کا سب سے بڑا پاپ سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اور نشوونما میں سب سے زیادہ ماں کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ سب سے پہلی درسگاہ ماں کی گود ہی ہے جہاں بچہ اپنی ذہنیت اور فطرت کی تکمیل کرتا ہے۔

پیدائش

اسی نیک اور عبادت گزار خاتون کے ہاں تین بچے یکے بعد دیگرے ہونے کے بعد ریاست پوربندر میں ۲؍اکتوبر ۱۸۶۹ء کو چوتھا بچہ ہوا۔ اور اس کا نام موہن داس گاندھی رکھا گیا جو نشوونما اور تکمیل زندگی کے بعد اب مہاتما گاندھی کے نام سے مشہور ہے

گاندھی جی کی عمر اب ۱۹۳۸ء میں ۶۹ سال کی ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان پر کیا گزری اور انہوں نے اپنی زندگی میں کیونکر انقلاب پیدا کیا یہی وہ حالات ہیں جنہیں آپ اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ پڑھیں گے۔

سات سال کی عمر تک

گاندھی جی کے والد مسٹر کرم چند ۱۸۷۶ء تک پوربندر میں دیوان رہے۔ اس سات سال کے عرصہ میں گاندھی جی کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ نہیں جو عام بچوں سے جداگانہ ہو۔ البتہ یہ ذہن کے بہت ہی کمزور تھے۔ اس لئے مدرسہ کے استاد اُن سے وہی سلوک کرتے تھے جو ایسے بدشوق بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ خود گاندھی جی کا بیان ہے کہ مجھ سے جب سبق یاد نہ ہوتا تھا تو استاد سزا دیتے تھے اور پھر ہم سب لڑکے اُن سے علیحدہ ہو کر انہیں خوب بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ مگر جب کوئی بڑا لڑکا اس مجلس میں آ کھڑا ہوتا تھا تو گاندھی جی وہاں سے بھاگ جاتے تھے۔ کیونکہ انہیں کسی غیر کے سامنے بات کرتے بہت ہی شرم آتی تھی۔ اور اس بات پر مدرسہ کے تمام لڑکے ان کا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔

راجکوٹ کے اسکول میں

۱۸۷۶ء میں مسٹر کرم چند راجستانی عدالت کے رکن منتخب ہو کر پوربندر سے راجکوٹ آ گئے اور یہاں موہن داس (موجودہ گاندھی جی) کو ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ ذہن اللہ کے فضل سے لیا دیا ہی تھا۔ استادوں نے اُن کی اس کمزوری سے تنگ آ کر سخت گیری شروع کر دی۔ جیسا کہ عام طور پر ایسے کند ذہن بچوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے۔ گاندھی جی بھی اُسی کے مستحق قرار دئے گئے۔ بالآخر وہاں سے ایک دوسرے اسکول میں منتقل ہوئے اور ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد تقریباً بارہ سال کی عمر میں گاندھی جی کو ایک ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔

اسکول سے روزانہ فرار

آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ جو شخص آج ہزاروں لاکھوں کے مجمع میں آزادانہ تقریر کرتا ہے۔ وہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے بے حد شرمیلا تھا۔حتیٰ کہ اپنے ہم عمر دوستوں سے بات کرتے ہوئے جھجکتا تھا۔آپ اس عجیب وغریب شرم کا اندازہ اس واقعہ سے بآسانی کرسکتے ہیں کہ جب اسکول کی چھٹی ہوتی تھی اور سب لڑکے اپنے اپنے گھر جایا کرتے تھے تو گاندھی جی یا تو کلاس میں دیر تک بیٹھے رہ جاتے تھے اور یا جلدی جلدی کلاس سے نکل کر بھاگتے تھے۔ تاکہ راستہ میں کسی دوست سے مڈبھیڑ نہ ہوجائے۔اور ایسا نہ ہو کہ وہ بات کر بیٹھے عام دوستوں کو گاندھی جی کی یہ حرکت اور اسکول کے بعد روزمرہ کا فرار بہت ہی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔مگر سب جانتے تھے کہ اس لڑکے میں شرم کا مادہ بہت ہے اور چونکہ وہ بات تک نہیں کرسکتا اس لئے روزمرہ سر پر پیر رکھکر اسکول سے بھاگتا ہے۔

سگرٹ کا چسکا

۱۸۸۱ء میں جب کہ گاندھی جی کی عمر تقریباً بارہ سال کی تھی سگرٹ کا چسکا لگ گیا۔اُن کے چچا تلسی داس جی سگرٹ پیا کرتے تھے ان کی دیکھا دیکھی گاندھی جی نے اور ان کے ایک دوسرے عزیز نے سگرٹ پینی شروع کردی۔مگر مشکل یہ تھی کہ اُن کے پاس سگرٹ کے اخراجات کے لئے پیسہ نہیں تھا۔چنانچہ ان دونوں لڑکوں کی گزر اس پر ہوتی تھی کہ تلسی داس جی کے سگرٹ کا وہ ٹکڑا جو وہ پی کر پھینک دیا کرتے تھے یہ اٹھالیتے تھے۔مگر اس طرح ٹکڑوں سے دو پینے والوں کا گزارا کیونکر ہوتا۔آخر کار ضرورت سے مجبور ہوکر گاندھی جی کو چوری جیسے خوفناک جرم کا خیال پیدا ہوا۔بچپن کی عمر تھی۔عقل نے نوکروں کے جیب خرچ کی طرف متوجہ کردیا۔اور اس طرح روزانہ پیسے چرا چرا کر یہ دونوں ننھے شوقین اپنا نشہ کرنے لگے۔رفتہ رفتہ خرچ بڑھا اور یہ چوری بھی شوق کو پورا نہ کرسکی تو گاندھی جی کو اپنی بے بسی اور اپنے شوق کو چوری چھپے پورا کرنے کی بندشوں

کا احساس ہوا۔ اور نئی نئی ترکیبیں سوچنے لگے۔

خود کشی کا ارادہ غلامی اور بے اختیاری کے خیالات نے طبیعت میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ اور اب خود کشی کے ارادے ہونے لگے گاندھی اور اُن کے دوسرے ساتھی نے اپنی اپنی تنگدستی کے احساسات کی بناء پر ایک مشورہ کیا۔ اور طے پایا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ لہذا ہم دونوں کو مر جانا چاہیئے۔ چنانچہ اس ارادہ کی تکمیل کے لئے ایک دن یہ دونوں مندر میں پہونچے اور درشن وغیرہ سے فارغ ہو کر خود کشی کے ارادہ پر عمل کرنے کے لیے جنگل میں ایک سنسان جگہ پہونچ گئے۔ جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ مگر ارادہ کو عمل میں لانا ذرا مشکل کام تھا۔ اور یہ تھے دونوں بچے۔ آخر کار ڈر گئے اور موت کے بھیانک تصوّر نے دونوں کے ہوائی قلعے کو مسمار کر کے رکھدیا۔ اس دلچسپ واقعہ کے متعلق گاندھی جی کے الفاظ یہ ہیں کہ "ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ رامجی مندر جاکر ذرا حواس درست کریں اور خود کشی کا خیال چھوڑ دیں"۔ البتہ اس ناقابل عمل پروگرام نے گاندھی جی کو اور اُن کے ساتھی کو ایک فائدہ پہونچایا۔ یعنی یہ کہ دونوں نے سگرٹ نوشی کی علّت کو خطرناک سمجھکر ہمیشہ کیلیے چھوڑ دیا۔ اور پیسے چرانے کی ضرورت بھی نہ رہی اس لئے ایک حد تک چوری کی عادت بھی ختم ہو گئی۔

بچپن میں شادی

گاندھی جی کی شادی اگرچہ ۱۸۸۲ء کے آخر میں یعنی تیرہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن شادی کے انتظامات اور اس کے واقعات بے حد دلچسپ ہیں۔ گاندھی جی کے لئے بیوی کی تلاش اُس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب کہ اُن کی عمر صرف چار سال کی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ منگنی ہو گئی۔ مگر اتفاق کی بات کہ منگنی کے مراسم مکمل ہونے کے

بعد ہونے والی دولہن کا انتقال ہوگیا۔ تب گاندھی جی کے والدین نے ان کی منگنی دوسری جگہ کردی اور دوسری جگہ بھی یہی کیفیت ہوئی کہ جب منگنی کے مراسم پر عملدرآمد ہوچکا تو بے چاری منگیتر چل بسی۔ اب خاندان والوں کی نظر میں گاندھی جی کی منگنی خوفناک بن گئی۔ اور کچھ عرصہ تک یہ معاملہ التوا میں پڑا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی کی عمر صرف پانچ سال کی تھی اور ان کو منگنی کی حقیقت تک کا پتہ نہ تھا وہ جانتے بھی نہ تھے کہ منگنی اور شادی کس چڑیا کا نام ہے۔

دو سال تک خاموشی رہی۔ اور کہیں منگنی یا شادی کا خیال گاندھی جی کے والدین کو نہ آیا۔ مگر جب مسٹر کرم چند (یعنی گاندھی جی کے والد) پوربندر سے راجکوٹ آگئے تو پھر ان کے دل میں گاندھی جی کی شادی اور منگنی کا خیال پیدا ہوا۔ اب کی بار پھر ایک جگہ بات ٹھہر گئی۔ اور منگنی کردی گئی۔ اس تیسری منگنی کا بھی گاندھی جی کو وقت سے پہلے علم نہ ہوسکا۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ بات چھ سال کی ہوچکی تھی اور ۱۸۸۲ء میں گاندھی جی کو پوری طرح یاد بھی نہ رہا تھا کہ ۱۸۷۶ء میں جو رسم ادا کی گئی تھی وہ خود انہی کی منگنی کا نمائشی کھیل تھی۔

ایک ساتھ تین شادیاں

مسٹر تلسی داس گاندھی یعنی مہاتما گاندھی کے چچا بھی انہی دنوں اپنے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھے۔ ادھر گاندھی جی کے والد دو لڑکوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ گاندھی جی کے دو بھائی اُن سے بڑے بھی تھے۔ جن میں سب سے بڑے کی شادی ہوچکی تھی اُن سے چھوٹے ابھی کنوارے ہی تھے اس لئے خاندان کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ گاندھی جی کے ساتھ ہی اُن کے منجھلے بھائی اور چچا زاد بھائی کی شادیوں سے سبکدوشی حاصل کرلی جائے۔

آپ جانتے ہیں ہندوستان کی ویش قوم شادی بیاہ کے معاملہ میں کتنی

نا عاقبت اندیشی ہے۔ اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ روپیہ پاس ہو اور آخری شادی کرنا ہو مسٹر کرم چند کو بھی بس یہی دو شادیاں کرنا تھیں اور تلسی داس جی بھی اپنے اسی لڑکے کی شادی سے سبکدوش ہو کر فارغ البال ہونے والے تھے چنانچہ اب آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ان کاٹھیا واڑی گاندھیوں نے ارمان پورے کرنے کے نام پر دولت کو کیسا کچھ براڈ کاسٹ کیا ہو گا۔ بہر حال خلاصہ یہ کہ بڑی شان کے ساتھ گاندھی جی تیرہ سال کی عمر میں ایک کمسن لڑکی کستورا بائی کے شوہر بنا دیئے گئے۔

چونکہ گاندھی جی بچپن میں ضرورت سے زیادہ شرمیلے تھے اور اپنے بے تکلف دوستوں سے بھی بچے بچے پھرتے تھے اس لئے آپ ہی اندازہ کیجئے کہ ایسی زندگی گزارنے والا بچہ شادی اور اس کے نتائج کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی کی نظر میں اس شادی کی صرف اتنی ہی اہمیت تھی کہ بیش قیمت اور بھڑک دار کپڑے پہننے کو ملیں گے۔ باجے بجیں گے اور ایک لڑکی ساتھ کھیلنے کو مل جائے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی جب یہ خیال آتا تھا کہ اگر اس لڑکی نے بات کرنے کی کوشش کی تو جواب کیسے دیا جا سکے گا۔ یا فرض کرو وہ کوئی سوال کر بیٹھی تو جواب دینے کون آئے گا۔ تو گاندھی جی کا چہرہ فق ہو جاتا تھا۔

مگر جب انسان پر کوئی مشکل پڑتی ہے تو خواہ وہ اس سے کتنا ہی بیزار ہو یا ڈرتا ہو آخر کار اسے برداشت کر ہی لیتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو مشکل آ پڑنے کے بعد انسان صرف یہ سوچتا ہے کہ جس چیز کو وہ مصیبت سمجھ رہا تھا وہ اتنی زیادہ تکلیف دہ نہیں ہے کہ اس سے خوف کیا جائے۔ چنانچہ گاندھی جی بھی بہت جلد اپنی بیوی کستورا بائی سے بے تکلف ہو گئے اور اجنبیت کا خوف جاتا رہا۔

شرمناک حالات

یہاں سے گاندھی جی کی وہ زندگی شروع ہوتی ہے جسے شاعروں نے عالم شباب کا خطاب دیکر اس کی پوجا کی ہے اور جو انسانی زندگی کا بیش قیمت حصہ سمجھی جاتی ہے۔ بعض لوگ اپنے اس زمانہ کو بھی اعتدال کے ساتھ بسر کر جاتے ہیں اور کبھی انگشت نمائی کا موقع نہیں دیتے۔ اور بعض آدمی جوانی کے جوش میں صحیح راستہ سے بھٹک جاتے ہیں اور شباب کا سورج اُن کی آنکھوں کو ایسا بے نور اور ماند کر دیتا ہے کہ کبھی کبھی وہ انسانیت اور خاندانی وجاہت اور اس کے وقار کو بھی بھول جاتے ہیں۔ شباب کا دیوتا انہیں صرف اپنی پوجا کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اور وہ شباب کے پجاری بننے کے شوق میں انسانی دنیا اور اس کے ماحول سے گزر کر ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتے ہیں جہاں نیکی اور بدی کا امتیاز ہی نہیں ہے بعض لوگ اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد بھی نیکی بدی کے فرق کو پہچاننے کی صلاحیت باقی رکھتے ہیں۔ لیکن نفسانی خواہشات کے عمیق سمندروں میں کچھ ایسے ڈوبتے ہیں کہ باوجود برائی بھلائی کے احساسات کے برسوں ساحل کی صورت نہیں دیکھ سکتے حالانکہ وہ خود اِن حالات کو بُرا سمجھتے ہیں۔ مگر شہوانی جذبات کے اثر سے ہمیشہ مغلوب رہتے ہیں۔

گاندھی جی کی زندگی نے جوان ہو کر اسی آخر الذکر طبقہ کو اپنا سمجھنے کی کوشش کی۔ گو انہوں نے جوانی کے عالم میں نفسانی خواہشات کو رسوائے عالم نہ ہونے دیا۔ لیکن پھر بھی ابتدائی جوانی شہوانی جذبات اور جسمانی لذتوں کے گہرے سمندروں میں غوطے کھانے لگی۔ خود گاندھی جی فرماتے ہیں کہ:-

"میں اپنی اس شرمناک حالت پر پردہ ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں"

اس کے علاوہ اس کیفیت کا ثبوت گاندھی جی کی زندگی کے اکثر واقعات سے ملتا ہے۔ جنہیں کتاب کے آیندہ اوراق میں بیان کیا جائے گا۔ البتہ یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ سن لیجئے۔

جن دنوں گاندھی جی کی شادی ہو رہی تھی تو اُن کے والد راجکوٹ میں ملازم تھے۔ شادی کی مراسم کے واسطے وہ رخصت لے کر پوربندر آئے تو راستہ میں کسی جگہ ان کی گاڑی ٹوٹ گئی اور وہ بری طرح زخمی ہو گئے۔ اس واقعہ کا حال جب گاندھی جی کو معلوم ہوا اور باپ کو زخمی دیکھا تو بہت رنجیدہ ہوئے مگر اگلے دن جب شادی ہو گئی اور بیوی سے ملاقات ہوئی تو ان دلچسپیوں میں وہ قطعی بھول گئے کہ باپ کس تکلیف میں ہے۔

اس واقعہ میں گو گاندھی جی کی غفلت اور شادی کی دلچسپی کا ثبوت ملتا ہے لیکن میرے خیال میں اس معاملہ سے گاندھی جی کی ازدواجی زندگی یا شہوانی خیالات کا کوئی تعلق نہیں۔ تیرہ سال کی عمر میں یہ حالات پیش آنے کے بعد ہر نا سمجھ بچہ ایسی افعال کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ البتہ آگے کے واقعات ان حالات کو ضرور بے نقاب کرتے ہیں۔

نفسانی خواہشوں کا بندہ

گاندھی جی اپنی ماں کی تربیت اور تعلیم کی بدولت ہمیشہ سچائی کے عاشق رہے ہیں۔ آپ اس کتاب میں پڑھ چکے ہیں کہ گاندھی کی والدہ کے نزدیک ہر قسم کا گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ ہر پاپ کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن جھوٹ ایک ایسا خوفناک اور ناقابل تلافی جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ گاندھی جی نے "سچ" کو پوری طرح اہمیت دی اور

اس پر زندگی کے تمام حصوں میں حتی المقدور پوری طرح عمل کیا ہے۔ گاندھی جی کا یہ بھی ایمان ہے کہ والدین کی اطاعت اور اُن سے سچی محبت کرنے کا نتیجہ لازمی نجات ہے۔ گو جوانی کے عالم میں نفس نے انہیں ایک غیر مفید راستہ پر ڈال دیا تھا اور انہیں نفسانی خواہشوں کا بندہ بنا دیا تھا لیکن والدین کی اطاعت اور اس کی اہمیت کو وہ کبھی فراموش نہ کر سکے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ:۔

"مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی اور دل و جان سے ان کی اطاعت کرتا تھا مگر اسی کے ساتھ نفسانی خواہشوں کا بندہ بھی تھا ابھی میں نے یہ نہیں سیکھا تھا کہ والدین کی بندگی اور خدمت کی خاطر اپنی راحت و مسرت قربان کر دینا چاہیے۔ مگر ایک واقعہ[1] جسے میری لذت پرستی کی سزا سمجھنا چاہیے ایسا ہوا جس کی چبھن میرے دل سے آج تک نہیں گئی۔ الخ

بہرحال گاندھی جی کی ابتدائی جوانی نے گو اعتدال کی حدود کو پوری طرح برباد نہیں کیا اور آج کل کے نوجوانوں کی طرح اپنے شباب کو در بدر کی ٹھوکریں بھی نہیں کھلوائیں اور آبا و اجداد کی عزت و آبرو کو بھی کسی وقت خطرہ کا شکار نہ ہونے دیا۔ پھر بھی یہ طے شدہ واقعہ ہے کہ ان کی جسمانی لذت طلبی اعتدال کو زخمی کرتی رہی اور اس تلخ حقیقت سے اس وقت آنکھ کھلی جب ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور انہیں ذمہ دارانہ زندگی کا بادلِ ناخواستہ مالک بننا پڑا۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شہوانی خیالات کی دست درازیاں اپنی جائز اور کم سخن اور اطاعت شعار بیوی سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے گاندھی جی کو بدنامی کے پہاڑوں سے ٹکرانے دیا۔

---

[1] جہاں تک میرا خیال ہے اور میں نے جستجو کی ہے یہ واقعہ گاندھی جی کے والد مسٹر کرم چند گاندھی کے انتقال کے وقت کا ہے۔ اُس وقت گاندھی جی اپنی بیوی کے پاس سونے کے کمرہ میں تھے۔

ان پڑھ بیوی

گاندھی جی کو اپنی بیوی کستورا بائی کا غیر تعلیم یافتہ ہونا پسند نہ تھا اور وہ انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ خود کستورا بائی کو اپنی جہالت کا احساس نہیں تھا۔ اور نہ وہ اپنے لئے تعلیم کو ضروری یا مفید سمجھتی تھیں۔ افسوس ہے کہ اسی کمزوری نے گاندھی جی کی بیوی کو شہرت اور قومی خدمت سے باز رکھا۔

پڑھانے کا شوق

اس بدشوقی کے باوجود گاندھی جی نے ہمت نہیں ہاری اور انہیں بیوی کو تعلیم دینے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ انہوں نے ہر چند چاہا کہ کسی طرح کستورا بائی تعلیم حاصل کرلیں۔ طرح طرح سے مثالیں دے کر سمجھایا۔ مستقبل کی ضرورتوں پر روشنی ڈالی۔ مگر ایک بدشوقی کے سامنے تمام کوششیں بیکار گئیں۔ اور سالہا سال کی محنت کا صرف اتنا نتیجہ نکل سکا کہ کستورا بائی کو سیدھے سادے گجراتی خطوط لکھنے اور پڑھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔

بیوی سے بے پناہ الفت

شادی کے ابتدائی زمانہ میں گاندھی جی کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ ہر وقت اُنہی کے خیال میں ڈوبے رہتے تھے۔ صبح سے رات کے دس گیارہ بجے تک علیحدگی کا تمام وقت تصوّر میں گزر جاتا تھا۔ خیال ہی خیال میں ہوائی قلعے تعمیر ہوتے تھے۔ گفتگو کے پروگرام بنتے تھے۔ بات چیت کے نئے نئے موضوع تلاش کئے جاتے تھے۔ غرضیکہ جو کچھ کمسنی کی شادی کے نتائج ضروری ہیں وہ سب رفتہ رفتہ سامنے آتے جارہے تھے۔

شہوانی محبت

اس عمر اور ان حالات میں سچی اور جھوٹی محبت میں مستقل تمیز کی جاسکتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس زمانہ کی محبت کو اور اس کی صحیح وجہ کو سمجھ سکیں۔ ابتدائی زندگی ہوتی ہے اور انسان بے سوچے سمجھے شباب کے عمیق سمندروں میں کود پڑتا ہے۔ اس کی عقل اور دوراندیشیوں پر محبوب کا تصور ایک

ایسا پردہ ڈالتا ہے جس کے باعث انسان شہوانی محبت اور اصلی محبت کا فرق ہی نہیں جان سکتا۔ واقعات شاہد ہیں کہ گاندھی جی پر اس زمانہ میں یہی کیفیت تھی۔ انہیں اپنی بیوی سے جو بے پناہ محبت تھی۔ اس میں شہوانی خیالات کو بہت کافی دخل تھا۔

روزانہ رات کا انتظار

چنانچہ شادی کے ابتدائی زمانہ میں خود گاندھی جی کا بیان ہے کہ وہ ہر وقت آنے والی رات کے تصور میں محو رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اسکول میں بھی اُن کے دل و دماغ سے رات کا انتظار علیحدہ نہ ہوتا تھا۔ اسکول میں ماسٹر صاحب پڑھا رہے ہیں۔ تمام لڑکے شوق سے اپنا اپنا سبق پڑھ رہے ہیں مگر گاندھی جی کے دل و دماغ پر کوئی اور ہی سبق چھایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہندوستانی شاعر کسی مشاعرے کے لئے کوئی انوکھی غزل تیار کر رہا ہو۔

شادی سے تعلیمی نقصان

ظاہر ہے کہ تعلیمی زندگی میں اس خوفناک غلطی اور بے پروائی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آخر کار وہ گاندھی جی کو بھی بھگتنا پڑا تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع ہو گیا۔ چونکہ خود گاندھی جی کو تعلیم سے اک لگاؤ تھا۔ اس واسطے انہیں اس نقصان کا بہت افسوس ہوا۔ مگر یہ افسوس بعد از وقت تھا۔ اگر انسان اپنے نفع نقصان کو پہلے سے سوچنے کا عادی ہو جائے تو زندگی کے بہت سے تفکرات اور نقصانات سے نجات پا سکتا ہے۔ مگر ایسا مشکل ہے کیونکہ شہوانی خیالات جیسی سنگلاخ زمین میں مآل اندیشی کی زراعت سے نتیجہ کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص پتھروں کی چٹان پر کوئی پیڑ لگانے کی کوشش کرے۔

فراق کی کہانی

اہلِ ہنود میں کم سنی کی شادیوں کا عام رواج ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ دستور بھی عام ہے کہ شادی کے ابتدائی زمانہ میں دولہن زیادہ تر اپنے میکے میں (ماں کے ہاں) رہتی ہے۔ پھر بھی صحت کو برباد کرنے کے لئے کم سن میاں بیویوں کو کافی وقت مل جاتا ہے۔

کستورا بائی بھی شادی کے ابتدائی پانچ سال میں مجموعی طور پر تقریباً دو ڈھائی سال سسرال میں رہیں اور باقی وقت میکہ میں گزرا جس زمانہ میں وہ ماں کے ہاں چلی جاتی تھیں گاندھی جی ایک پرستار شوہر کی طرح بے قرار رہتے تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ محبت ایک طرفہ ہی تھی۔ یا "دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی" لیکن واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ۔ جوش و خروش غالباً ایک طرفہ ہی تھے۔ ورنہ آگے چل کر جو نئی نئی باتیں پیدا ہوئیں یا تو بالکل ہی نہ ہوتیں یا ایک حد تک اُن میں کمی ضرور ہوتی۔ مگر اس حقیقت کا ضرور اعتراف کرنا پڑیگا کہ گاندھی جی اس جدائی کے زمانہ کا بہت احساس کرتے تھے یہاں تک کہ اسی باعث تعلیم کا ایک سال بھی برباد کر دیا۔

وحشیانہ پردہ بعض اوقات بیوی کی موجودگی میں بھی فراق کا اثر محسوس کیا جاتا تھا۔ اُن دنوں کاٹھیاواڑ کے ہندو خاندانوں میں ایک عجیب قسم کا وحشیانہ پردہ رائج تھا۔ مثلاً بزرگوں کے سامنے ہندو شوہر کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ دن میں کسی وقت بھی اپنی بیوی سے گفتگو کر سکے۔ یا ایسا کوئی موقع نکالا جا سکے جہاں میاں بیوی ایک دوسرے کا دکھ درد سن سکیں۔ اسے انتہائی بے غیرتی اور بے حیائی سمجھا جاتا تھا۔ جدائی کی اس عجیب وجہ نے فراق کی داستان کو اور بڑھا دیا۔ مگر یہ ایک ایسی مجبوری تھی جس کا حل اُس زمانہ میں نہیں تھا۔ پردہ[۱] کی اس عجیب رسم سے بقول گاندھی جی کے انہیں ایک فائدہ بھی پہنچا۔ یعنی یہ کہ شہوانی خیالات کے باعث شباب کی بے جا ضرورتیں پیدا کرنے کے موقعے ایجاد کرنے میں ایک حد تک کمی رہی اور اس طرح صحت جسمانی کو کسی قدر کم نقصان پہونچا۔

---

[۱] اب اس پردہ کی سختیوں میں بہت کمی ہو گئی ہے۔

ایک بدچلن دوست

گاندھی جی کے منجھلے بھائی (جن کی شادی گاندھی جی کی شادی کے ساتھ ہوئی تھی) اسی اسکول میں انہی کے ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وہ ان سے ایک درجہ اوپر تھے، مگر شادی نے اُن کی تعلیمی زندگی ختم کر دی۔

اُن کا ایک دوست تھا جس سے رفتہ رفتہ گاندھی جی کی بھی دوستی ہو گئی۔ یہ شخص ایک امیر کا بیٹا تھا اور ماں باپ کی بے توجہی اور لاڈ کے باعث بُری صحبتوں میں پھنس کر آوارہ خیالات کا ہو گیا تھا۔ جب گاندھی جی کے والدین کو اس دوستی کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اس کی دوستی ترک کر دینے کی ہدایت کی مگر اس ہدایت کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ گو علانیہ میل جول میں ایک حد تک کمی ہو گئی مگر چپ چپاتے دوستی کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔

یہ شخص بہت ہی بُرے اور مفسدانہ حالات کا آدمی تھا۔ نہ مذہب کے احترام کا قائل تھا اور نہ بزرگوں کی عزت و آبرو کا کوئی پاس کرتا تھا۔ خود کستورا بائی نے گاندھی جی کو کئی بار متنبہ کیا مگر انہوں نے شوہرانہ غرور کے ساتھ بیوی کی ان کار آمد نصیحتوں کو ٹھکرا دیا۔ اگرچہ بعد میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا مگر وقت گزرنے اور کافی ٹھوکریں کھا چکنے کے بعد۔

بُری صحبت کا اثر بزرگوں کا اور اپنی ہمدرد بیوی کا کہنا نہ مان کر گاندھی جی نے یقیناً بُرا کیا۔ بدی کا اثر ہونا یقینی تھا اور ہو کر رہا۔ گاندھی جی کے خیالات میں اگرچہ ماں کی ٹھوس تربیت کے سبب پوری طرح زلزلہ نہیں آیا پھر بھی ایک حد تک وہ اس بدچلن دوست کے اثر سے مغلوب ہو گئے۔ اور دانستہ یا نادانستہ وہ اس کے بعض بُرے خیالات کو اپنے لئے بھی اچھا سمجھنے لگے۔ یہ شخص باہر کی عورتوں کا بری طرح دلدادہ تھا۔ چنانچہ اس نے گاندھی جی کو بھی اپنا ہم خیال بنانا

چاہا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ گاندھی جی اس خوفناک گناہ سے ہمیشہ بچے رہے تاہم بازاری عورتوں کے متعلق گاندھی جی کے خیالات میں جو سختیاں تھیں ان میں یقیناً کمی ہوئی اگر کمی نہ ہوتی تو جیسے ہی گاندھی جی کو یہ علم ہوا تھا کہ یہ شخص اتنے بُرے خیالات رکھتا ہے اور ایسے خوفناک جرائم کے ارتکاب کو بھی اہم نہیں سمجھتا فوراً اس سے دوستی منقطع کر دیتے مگر انہوں نے اپنے دوست کے اس ذلیل فعل کو بری نظر سے دیکھنے کے باوجود اپنا بچاؤ نہیں کیا۔ بلکہ جی کو سمجھانے کیلئے یہ تاویل گھڑ لی کہ اس دوست کی اصلاح کرنی ضروری ہے اور یہی خیال انہوں نے اپنے بزرگوں سے ظاہر کیا۔ جب کہ ان لوگوں نے انہیں اس دوست سے ملنے کو منع کیا تھا۔

بہرحال یہ قطعی فیصلہ ہے کہ گاندھی جی کی زندگی نے اکثر عیب اسی برے دوست سے سیکھے تھے۔ جن کا سب سے پہلا تکلیف دہ اثر خود گاندھی جی کی بیوی کو برداشت کرنا پڑا۔

بیوی پر ظلم

کچھ تو بیوی کے بار بار نصیحتیں کرنے اور اس شخص کی دوستی ترک کر دینے کے مشورے سے اور کچھ اس بُرے دوست کی صحبت اور خیالات کے ماتحت اب گاندھی جی کو اپنی بیوی میں اکثر بُرائیاں اور کمزوریاں نظر آنے لگیں۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرنے کے علاوہ اور کیا ہوتا۔ بے چاری بے زبان بیوی اندر ہی اندر ہدف ملامت بنتی رہی، جھڑکیاں سنتی رہی۔ مگر شریف باپ کی شریف بیٹی نے بڑی خوشی سے پتی کے ان تحائف کو قبول کیا جو وقتاً فوقتاً ڈانٹ ڈپٹ کے موقعوں پر الفاظ کی صورت میں اُسے ملے۔ وہ انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ اپنے ناسمجھ شوہر کی بے جا سختیاں سہتی رہی۔ مگر اصلاح کا جذبہ اُس کے دور اندیش اور عاقبت شناس قلب میں پوری طرح موجزن رہا۔

بیوی سے بدگمانی

بری صحبت کے اثر نے گاندھی جی کے مضبوط خیالات کو زخمی کر دیا تھا۔ اور نوجوانی کی مطلق العنان حکومت کے سامنے وہ ایک فرمانبردار محکوم کی حیثیت سے نظر آتے تھے۔ دوست جو کچھ کہتا تھا۔ اس پر آمنّا اور صدقنا کہنا ان کے لئے معمولی بات ہو گئی تھی۔ چنانچہ اسی برے دوست کی دوستی کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی اپنی پاک دامن بیوی سے بدگمان ہو گئے۔ اور اس لغو اور بے بنیاد خیال نے ظلم کی رسی کو اور بھی دراز کر دیا۔ غریب اور بے زبان کستورا بائی نے اسے بھی شوہر کا ناز سمجھا اور ہنسی خوشی سر تسلیم خم رکھا۔ مگر بری صحبت کو ابھی بہت کچھ کرنا تھا اس لئے حالات کی رفتار بڑھتی ہی رہی۔

بیوی پر شبہ

بدطینت دوست نے گاندھی جی کو اپنے پرائے کی تمیز سے بھی بالائے طاق رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ موہن داس بھی اسی کی طرح "آدمی" بن جائے۔ گو گاندھی جی کا ضمیر ہمیشہ اعلےٰ خیالات کا مالک رہا اور اس زمانہ میں بھی ضمیر کی خودداریاں صراط مستقیم سے نہ ڈھلک سکیں لیکن ضمیر کُشی ایک ایسا خوفناک ارتکاب ہے جس کے عمل کے بعد انسان اپنے آپ کو خدا کا بندہ بھی نہیں سمجھنا چاہتے۔

• گاندھی جی کا ضمیر ہمیشہ اس دوستی کے خلاف احتجاج کرتا رہا مگر بعض اوقات وہ بھی تلملا کر رہ جاتا تھا۔ کیونکہ جوانی کے نشہ میں انسان ضمیر کی آواز کو ذرا کم سننے کا عادی ہوتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جبکہ اسے برے دوستوں کی صحبت میسّر ہو۔ اور گناہگاری کے باوجود یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہو کہ میں کوئی گناہ نہیں کر سکتا۔

بیوی پر پابندیاں

بری دوستی کے سیاہ اثرات نے ایک قدم اور بڑھایا تاکہ تباہی اور رسوائی کے دیوتا پر چند اچھوتی آبروؤں کا چڑھاوا چڑھایا جا سکے۔ اور ظلم کی دیوی کو شوہرانہ اختیارات کے بے جا استعمال سے پوری طرح

سجا دیا جائے چنانچہ غریب کستورا بائی پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہونے لگیں۔ انہیں حویلی (مندر) جانے سے روکنے کی کوشش کی گئی۔ ہم عمر سہیلیوں سے ملنے جلنے پر روک ٹوک ہوئی۔ عزیز رشتہ داروں سے میل ملاقات پر پابندیاں لگائی گئیں۔ وفادار بیوی یہ سب کچھ بھی برداشت کرتی رہی اور بری صحبت کی غیر ضروری تقلید کرنے والے شوہر کے خلاف اِن روح فرسا تکالیف کے باوجود حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔ اس کے سامنے اب بھی اصلاح کا خیال تھا اور اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن گاندھی جی اپنی غلط روی کا احساس کریں گے اور اِن لغو پابندیوں پر خود ہی شرمندہ ہو جائیں گے۔

بیوی کی نافرمانی

صبر اور برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کستورا بائی نے اُس کی پوری طرح پابندی کی اور مشرقی تہذیب اور مشرقی عورت کے حُسن ضبط و تحمل کا حتی المقدور اچھا نمونہ پیش کیا۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہی ہوتے چلے گئے اور آخر کار وہ دن آہی پہونچا جب پیر کے نیچے دبی ہوئی چیونٹی بھی کاٹ کھاتی ہے۔ کستورا بائی کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا انہوں نے برداشت کی آخری حد تک ایک وفادار اور فرمانبردار بیوی کی طرح شوہر کی عائد کردہ پابندیوں پر عمل کیا مگر تابکے۔ مجبوراً نافرمانی کا قدم بڑھانا پڑا۔ ان تمام پابندیوں میں خصوصیت کے ساتھ حویلی جانے کی روک ٹوک کا انہیں بہت صدمہ تھا۔ چنانچہ اب یہ کیفیت ہو گئی کہ حویلی پوجا کے معاملہ میں انہیں شوہر کے حاکمانہ برتاؤ کا احساس نہیں رہا۔ اور انہوں نے خود ہی یہ پابندی اپنے اوپر ضروری نہ سمجھکر اطاعت کا خیال ترک کر دیا۔ اور کبھی کبھی حویلی جانے لگیں۔ پوجا پاٹ کا ہمیشہ سے انہیں شوق تھا اور یہ پابندی ہمیشہ ہی انہیں ناگوار گزری آخر کار ضبط کی انتہا نے اپنی حدیں توڑ دیں اور پوجا کا راستہ خود ہی صاف کر لیا۔

بیوی کی بے باکی

گاندھی جی کو اس نافرمانی سے بہت تعجب ہوا۔ اور انہوں نے تنہائی میں اس کی باز پرس شروع کی۔ مگر کستورا بائی خاموش

رہیں اور عبادت کا حوالہ دے کر گاندھی جی کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔
گاندھی جی اپنے خیالات پر اٹل رہے۔ بلکہ اب پہلے سے زیادہ سختی کے ساتھ ہمجولیوں سے ملنے جلنے کی ممانعت شروع کر دی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آخر کار کستورا بائی بھی شریفانہ مقابلہ کے لئے تیار ہو گئیں۔ اور جس جگہ کیلئے گاندھی جی منع کرتے وہ قصداً وہیں جاتیں۔ اور جس کام کو منع کرتے وہی کرتیں۔
گو بادی النظر میں خصوصاً قدامت پرستوں کے خیال میں کستورا بائی کا یہ فعل گناہ اور گستاخی کی زد میں آتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان حالات میں اس نیک خاتون نے جو کچھ بھی کیا وہ انسانی فطرت خصوصاً عورت کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ اگر اس طرح بے باکانہ طریقہ سے وہ جرأت اور دلیری کا مظاہرہ نہ کرتیں تو یقیناً مزید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اور عجب نہیں کوئی بڑا نقصان ہو جاتا۔

گاندھی جی کی جھنجلاہٹ

اس یکایک بے باکی اور دلیری سے گاندھی جی کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی مگر بزرگوں کے خوف سے وہ کوئی ایسا غلط قدم نہ اٹھا سکے جو شرافت پر دھبہ لاتا۔ یا کوئی بدنامی کی صورت پیدا کرتا لیکن یہ ضرور ہے کہ بیوی کے خلاف ان کے دل میں محبت کے ساتھ ساتھ کسی قدر تنفر بھی پیدا ہو گیا جس نے آگے چل کر بیوی سے بے وفائی کرنے کا خیال بھی ان کے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بول چال بند

اس دلیری اور بے باکی کی سزا دینی بہت آسان تھی لیکن بزرگوں کی موجودگی اور سماج کی پابندیوں کے خوف نے گاندھی جی کو ان تمام خیالات سے باز رکھا جو ایک ہندوستانی شوہر اپنی بے کس بیوی کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ پھر بھی انہوں نے اس بے باکی کی سزا دی اور وہ اس صورت میں کہ جب جی چاہا یا کوئی بات مزاج کے خلاف ہوئی بول چال بند کر دی۔
گفتگو کا بند کر دینا اگرچہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس تلخی کو صرف وہی بیویاں

محسوس کر سکتی ہیں جو اپنے شوہر کی ہر طرح سے وفادار ہوں اور ہمیشہ ان کے خیالات کی تائید کرتی رہی ہوں اور اس کے باوجود شوہر صاحب کسی معمولی بات پر اُرد کے آٹے کی طرح اینٹھ کر خواہ مخواہ بول چال بند کریں اور بیوی کو روحانی تکلیف پہونچائیں۔ بہرحال یہ سزا بھی مظلوم کستورا بائی نے جیسے تیسے اصلاح کی امید پر برداشت کرلی۔

بھوت اور چور کا خوف

گاندھی جی بچپن میں عام بچوں کی طرح ڈرپوک بہت تھے۔ چور۔ بھوت۔ اور سانپ کے نام سے ان کی روح کانپتی تھی۔ شادی کے بعد بھی یہ بزدلی قائم رہی۔ مگر بیوی کی موجودگی میں اس کا اظہار کرنے سے شرماتے تھے۔ کیونکہ کستورا بائی طبیعت کی دلیر تھیں اور ان پر ایسے واہمے اثر انداز نہ ہوتے تھے۔ مگر گاندھی جی کا یہ عالم تھا کہ رات کو اندھیرے میں انہیں نیند نہیں آسکتی تھی اس لئے ان کے کمرے میں رات بھر روشنی رہتی تھی۔ گاندھی جی کا بیان ہے کہ اگر کسی دن رات کو مجھے اندھیرے میں لیٹنا پڑتا تھا تو مجھے چاروں طرف سے بھوت اور سانپ آتے ہوئے نظر آتے تھے۔

گاندھی جی کی اس کیفیت سے اُن کا دوست بھی باخبر تھا۔ اور وہ اکثر ایسی کوشش کرتا رہتا تھا کہ ان کے دل سے یہ غلط اور بزدلانہ خیال دور ہوجائے۔

گوشت خوری کی ابتدا

جب گاندھی جی کا یہ خوف کسی طرح دور نہ ہوا تو دوست نے طرح طرح سے گوشت خوری کا مشورہ دینا شروع کیا۔ اوّل اوّل تو گاندھی جی گوشت کے نام سے کوسوں بھاگتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ دوست کی نصیحتیں کارگر ہونے لگیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ گوشت کھانے سے انسان طاقتور اور مضبوط ہوجاتا ہے۔ اور حکومت کرنے کا اہل ہوجاتا ہے۔ لوگ اس کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ انگریزوں کو پیش

کرتا تھا کہ محض گوشت خوری کے باعث دنیا کے بڑے علاقہ پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ بات گاندھی جی کی سمجھ میں آ گئی۔ انہیں قوم پرستی کا ہمیشہ خیال رہا ہے۔ اس زمانہ میں بھی گاندھی جی کو اپنی قوم کی غلامی اور بے کسی کا خیال تھا۔ جی میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اگر ہندو قوم گوشت کھانے لگے تو طاقتور ہو جائے گی اور پھر آسانی کے ساتھ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیا جائیگا۔ چنانچہ گاندھی جی نے گوشت کے استعمال کا ارادہ کر لیا۔

آخر کار دوست کے مشورے سے ایک دن مقرر ہوا۔ اور دریا کے کنارے گوشت پکانے اور کھانے کی تجویز ہوئی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر گاندھی جی وہاں پہونچ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اُن کے منجھلے بھائی بھی وہاں موجود ہیں۔ اول اول تو گاندھی جی کو شبہ ہوا کہ دوست نے بدنام کرنے کے لئے یہ دھوکا دیا اور منجھلے بھائی کو پہلے سے بلا کر بٹھا لیا ہے مگر بعد کو پتہ چلا کہ منجھلے بھائی گوشت خوری میں عرصہ سے اس دوست کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اب انہیں دوست کی باتوں کا یقین ہوا۔ اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ گوشت کھانے سے یقیناً جسم میں طاقت بڑھ جاتی ہے کیونکہ منجھلے بھائی گاندھی جی سے جسمانی طاقت میں کہیں زیادہ تھے۔

پیٹ میں زندہ بکری

یہ لوگ خمیری روٹی بازار سے خرید کر اپنے ساتھ لے گئے تھے اور گوشت دریا کے کنارے تیار کیا تھا۔ آپس میں مل جل کر کام کیا۔ چنانچہ جب سالن تیار ہو گیا تو یہ تینوں کھانا کھانے بیٹھے۔ منجھلے بھائی نے اور دوست نے بہت اطمینان کے ساتھ کھانا شروع کر دیا مگر گاندھی جی شروع میں تو بہت جھجکے لیکن بھائی اور دوست کے اصرار سے آخر کار ایک لقمہ کھا ہی لیا جیسے ہی لقمہ گاندھی جی کے موہنہ میں گیا اور انہوں نے چبایا تو متلی ہونے لگی۔ اس پر گاندھی جی نے ہاتھ روک لیا مگر طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ اور آخر کار قے ہو گئی۔

دونوں ساتھیوں نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا۔ شروع میں ایسا ہوتا ہی ہے رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی اور ہماری طرح شوق سے کھانے لگو گے۔

اُسی رات گاندھی جی کو طرح طرح کے خواب نظر آئے۔ انہیں سوتے میں ایسا محسوس ہوا کہ اُن کے پیٹ میں زندہ بکری موجود ہے اور وہ زور زور سے بول رہی ہے۔ ساری رات اسی قسم کے ڈراونے خواب نظر آتے رہے۔

والدین کے ساتھ دھوکا

دو چار روز کے آگے پیچھے اکثر یہ دعوتیں ہوتی رہیں اور رفتہ رفتہ گاندھی جی کو گوشت کا چسکہ پڑ گیا۔ اب وہ بڑے شوق سے گوشت کھانے لگے۔ جس دن یہ دعوت ہوتی تھی گاندھی جی خوب پیٹ بھر کر کھانا کھاتے تھے۔ مگر اس میں ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ جس روز وہ اس دعوت میں شریک ہوتے تھے رات کا کھانا گھر نہ کھا سکتے تھے اور جب ان کی والدہ کھانے کے لئے اصرار کرتیں تو گاندھی جی اخفائے راز کے خیال سے دانستہ یہ جھوٹ بولتے تھے کہ آج پیٹ میں خرابی ہے۔ اور کھانا نہیں کھا سکوں گا۔

اس دھوکا دہی سے ہمیشہ ہی گاندھی جی کو تکلیف ہوتی تھی۔ گھنٹوں ان کا ضمیر ملامت کرتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ سچ بولنے کے عادی تھے مگر اس نازک موقع پر سچ کا استعمال اُن کے نزدیک ہدف ملامت بننے کا سبب تھا۔ اور گوشت جیسی عجیب چیز سے دور ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس واسطے عرصہ تک گاندھی جی اپنے ضمیر کا خون کر کے والدین کو دھوکا دیتے رہے۔

کھلم کھلا گوشت خوری

اس ضمیر کشی سے گاندھی جی کو بہت صدمہ ہوتا تھا بارہا انہوں نے ارادہ کیا کہ یہ گناہ ترک کر کے آئندہ کے لئے عہد کریں اور ضمیر کا زیادہ عرصہ تک خون نہ کریں۔ لیکن زبان کے ذائقے نے بہت دن اس ارادہ سے باز رکھا۔ بلکہ یہاں تک ارادہ کو مضبوط کر دیا کہ فی الحال ضمیر کی

خاطر گوشت خوری ترک کر دینی چاہئے۔ جب ماں باپ دنیا میں نہ رہیں گے اور جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ پڑے گی تب کھلم کھلا گوشت کھایا جائے گا۔

ہندو قوم میں گوشت خوری کی ترغیب

اس عجیب خیال نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ گاندھی جی کو اس فیصلہ کیلئے بھی مجبور کر دیا کہ وہ اپنی قوم میں بھی گوشت خوری کا پروپیگنڈا کریں گے اور قوم کو بتائیں گے کہ ہماری غلامی و محکومی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم لوگ گوشت خوری سے پرہیز کرتے ہیں اور چونکہ گوشت نہ کھانے کے باعث ہم کمزور ہوتے جارہے ہیں لہذا ایک وقت وہ آجائے گا کہ ہم قیامت تک آزادی کا مونہہ نہ دیکھ سکینگے اس لئے گوشت کھانا اشد ضروری ہے۔

گو ریفارم کا یہ خیال گاندھی جی کے دل میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا تاہم جتنے عرصہ تک وہ خود گوشت کھاتے رہے ان کا یہی ایمان رہا کہ گوشت خوری کے بغیر انسانی جسم کی نشو ونما اور طاقت ناممکن ہے۔

بیوی کی حق تلفیاں

اس تباہ کن دوست نے گاندھی جی میں مختلف نئی باتیں پیدا کر دی تھیں۔ مذہب کے خلاف انہیں گوشت خوری پر آمادہ ہی نہیں کیا بلکہ بے انتہا دلدادہ بنا دیا۔ مگر سب سے زیادہ تباہ کن نصیحت جو اس نے کی یہ تھی کہ موجودہ بیوی (کستورا بائی) ناقابل توجہ ہے لہذا اس توجہ کو ذرا وسعت دے کر دنیا کے دوسرے پہلو سے بھی فائدہ اٹھانا چاہئے یہ وہ وقت تھا جب گاندھی جی اپنے اسی دوست کی اصلاح کا ایک طوفان دل میں لئے ہوئے تھے مگر انہیں خبر نہ تھی کہ شیر و شکر ہونے سے دوست کی اصلاح تو کیا ہو گی خود ہی اس تباہ کن اور برباد کر دینے والی آگ میں کود رہے ہیں۔

غیر عورت کے پاس

اس تباہ کن دوست نے گاندھی جی کو برباد کرنے میں شاید ہی کوئی کسر باقی چھوڑی ہو۔ ایک دن اُس نے گاندھی جی کو ایک نئی راہ بتائی۔ وہ ان کو ایک ایسی بدنام جگہ لے گیا جہاں عموماً فاحشہ عورتیں رہتی تھیں۔ غالباً تمام انتظامات پہلے ہی ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس نے گاندھی جی کو ایک کمرہ میں بھیجا۔ گاندھی جی خود بھی جانتے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں مگر شباب کے اشتعال نے اُنہیں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچنے دیا کہ گناہ بھی دنیا میں کیا جا سکتا ہے۔ وہ اندر چلے گئے۔ اور انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت ان کے انتظار میں پلنگ پر لیٹی ہے۔ گاندھی جی کو آتا دیکھ کر وہ مسکرائی اور ایک بازاری تبسم کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ یہاں پہونچ کر گاندھی جی کو اپنی سخت غلطی کا احساس ہوا مگر اب گناہ کے مونہہ میں آ چکے تھے۔ اور یہاں سے بچ نکلنا ایک معجزہ سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اول اول تو گاندھی جی بہت سٹ پٹائے۔ مگر پھر ان کے ذہن میں بچنے کی ایک ترکیب آگئی وہ بالکل خاموش اور گونگے بہرے کی طرح پلنگ پر اس عورت کے قریب بیٹھ گئے۔ وہ تھوڑی دیر تک تو کچھ انتظار کرتی رہی اور اس کے بعد اُس نے خود مخاطب کرنا چاہا۔ لیکن یہاں ایسا معاملہ تھا گویا کچھ تھا ہی نہیں رہا۔ بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ اس پر اس فاحشہ کو بہت غصہ آیا اور اُس نے بے شمار گالیاں دیکر گاندھی جی کو گھر سے نکال دیا۔

اخلاقی فتح یہ اگرچہ گاندھی جی کی توہین کہی جا سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی اخلاقی فتح یہی ہے کہ وہ عالم شباب میں گناہ کے مونہہ میں پہونچنے کے بعد بھی محفوظ رہے۔ ورنہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں کہ انسان جوان ہو اور بُری صحبت میں بھی مبتلا ہو مگر موقع حاصل ہونے کے بعد

صرف ضمیر کی آواز پر گناہ سے بچنے کا ارادہ کرے اور گناہ نہ کرے۔

مردمی کا بٹہ لگ گیا

کہا جا سکتا ہے کہ اس بزدلی سے مردمی کو بٹہ لگ گیا اور بقول گاندھی جی کے انہیں بھی یہ محسوس ہوا کہ اس حرکت سے اُن کی مردمی کو بٹہ لگ گیا ہے۔ لیکن اخلاق کی نظر میں یہ بہت بڑی بہادری تھی۔ ایسی کارآمد بہادری جس نے گاندھی جی کی آیندہ زندگی کو بدنام ہونے سے ہی نہیں بچایا بلکہ ترقی اور شہرت میں بھی کافی مدد کی اور آئیندہ جوانی کی مزید لغزشوں سے بھی محفوظ رہنے کا سبق دیا اس لغزش کے متعلق گاندھی جی کے چند فقرے بہت ہی دلچسپ ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"اُس نے مجھے گالیاں دیکر گھر سے نکال دیا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میری مردمی کو بٹہ لگ گیا۔ اور شرم کے مارے جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں سما جاؤں" الخ

ضمیر کی کتنی سچی پکار تھی۔ اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انسان کو اس کا ضمیر صبح سے شام تک ہزارہا غلطیوں سے بچاتا ہے۔ مگر جو لوگ ضمیر کی آواز سننے کے عادی نہیں ہیں وہ اس دلچسپ اظہار حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور جو اس کی اہمیت کو جانتے ہیں وہ گاندھی کی طرح محض "ضمیر" کی پکار پر بڑی بڑی تباہیوں سے بچ جاتے ہیں۔

بیوی سے دشمنی

اس بدکردار دوست کی بدولت گاندھی جی اپنی بیوی سے بدظن ہوئے اور اُس غریب کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں۔

جس کے متعلق اُن کا بیان ہے کہ:۔

"اکثر میں نے اُس کی چغلخوری کی بنا پر اپنی بیوی کو دُکھ دیا ہے"

اس دوست نے گاندھی جی اور اُن کی نیک بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا کرا ئی۔ اور گاندھی جی کی خانگی زندگی کو عرصہ تک بے چین رکھا۔

بیوی سے بدگمانی کا ناسور

بہت دن تک گاندھی جی اسی رفتار پر رہے بیوی کے دکھ درد کی طرف سے یہ لاپروائی گو اندرونی تھی اور بزرگوں کو اس کا بہت کم علم تھا تاہم انہیں اپنی اس کمزوری اور عیب کا احساس اکثر ہوتا تھا۔ اور بقول گاندھی جی کے یہ بدگمانی کا ناسور اس وقت دور ہوا جب انہوں نے اہنسا (یعنی عدم تشدد) کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ لیا اور انہیں ضبط نفس پر قدرت حاصل ہوئی۔

آج تک ندامت

بیوی پر کئے ہوئے اس زمانہ کے ظلم وستم ایسے نہ تھے کہ گاندھی جیسا انصاف پسند اور حق گو آدمی بھول جاتا یہ دوسری بات تھی کہ شباب نے انکی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اور وہ بغیر سوچے سمجھے اپنی بے کس بیوی سے لاپرواہ ہوگئے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ تکمیل عقل کے بعد گاندھی جی کو اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس ہوا اور اب آکر ندامت ہوئی۔ اس کا خود گاندھی جی کو اعتراف ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"جب کبھی مجھے وہ شک وشبہ کے بھیانک دن یاد آتے ہیں تو مجھے اپنی حماقت اور اپنے شہوانی ظلم سے انتہائی نفرت ہوتی ہے اور اپنے دوست کی اندھی تقلید پر سخت افسوس ہوتا ہے"

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ کستورا بائی نے باوجود مختلف تکالیف کے مشرقی روایات اور تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اگر کہیں کستورا بائی اس زمانہ میں سمجھداری سے کام نہ لیتیں تو آج کیا ہوتا یہ کون جان سکتا ہے۔

کستورا بائی کی روشن زندگی آج کل کی ان ہندوستانی لڑکیوں کے لئے یقیناً "راہ ہدایت" ہے جو اپنی ناسمجھی اور جلد بازی کے سبب بنا بنایا گھر بگاڑ لیتی ہیں اور اس کے بعد تمام عمر پچھتانا پڑتا ہے۔ لیکن اس ہندو ناری نے ثابت کر دیا کہ ہر وہ کام جو

بظاہر ناممکن ہو۔ یا ناقابل حل ہو۔ ایک نہ ایک دن آسان نظر آنے لگتا ہے۔

چوری کی عادت

گاندھی جی ۱۸۸۱ء میں جب کہ وہ تقریباً بارہ سال کے تھے۔ سگرٹ نوشی کی علت میں پھنس کر بارہا چوری کے خوفناک جرم کا ارتکاب کر چکے تھے۔ جب انہیں سگرٹ کے لئے خرچ کی ضرورت ہوتی تھی تو نوکروں کے جیب خرچ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے۔ مگر یکایک یہ عیب دور ہو گیا اور انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ چوری جیسے سنگین جرم سے ہمیشہ بچے رہیں گے۔ لیکن گوشت خوری اور دوسری ضروریات نے انہیں ۱۸۸۴ء میں پھر مجبور کر دیا۔ اس وقت گاندھی جی کی عمر پندرہ برس کی تھی اور دو سال کے شادی شدہ تھے۔ لیکن نفس کے بھڑکانے اور دوست کے کہنے سننے سے اب پھر اسی خوفناک جرم کا ارتکاب کرنے پر مجبور ہوئے جس کے لئے کبھی عہد کر چکے تھے۔

اب کی مرتبہ چوری کا اثر منجھلے بھائی پر پڑا۔ یہ منجھلے بھائی گاندھی جی کے ساتھ اکثر گوشت کی دعوتوں میں حصہ لیتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر سونے کا بازو بند بندھا رہتا تھا۔ چنانچہ اس میں سے ایک ٹکڑا چرایا گیا مگر اس چوری نے گاندھی جی کے ضمیر کو بری طرح ہلکان کر دیا۔ اور انہوں نے ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر آئندہ کے لئے ہمیشہ محتاط رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اعتراف جرم آئندہ کی احتیاط کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی طے کیا کہ اپنے اس سنگین گناہ کی اطلاع اپنے والد کو کر دیں گے اور ان سے معافی مانگیں گے مگر ایسا کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی۔ تب انہوں نے اپنے جرم اور معافی کی درخواست کے ساتھ آئندہ کے لئے بہت محتاط رہنے کا وعدہ تحریر کے ذریعہ باپ کے سامنے رکھ دیا۔

مسٹر کرم چند اگرچہ اُس وقت بیمار تھے اور ایک ناسور کے باعث بہت ہی کمزور ہو گئے تھے لیکن اس تحریر کی ابتداء دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر سوچتے رہے اور اُس کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں سے زار زار آنسو جا رہے ہیں۔

گاندھی جی بہت دیر باپ کے سامنے اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ وہ معافی کے متعلق گناہگار بیٹے کو کوئی ہدایت دیں گے یا کم از کم یہ بتا دیں گے کہ انہوں نے معاف بھی کیا یا نہیں۔ مگر مسٹر کرم چند نے کچھ نہیں کہا اور پھر چپ چاپ لیٹ گئے۔ گاندھی جی ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ سمجھ گئے کہ انہوں نے نہایت خلوص کے ساتھ معاف کر دیا ہے۔

چوری نہ کرنے کا عہد

اس خلاف امید معافی نے گاندھی جی کی دنیا ہی بدل دی۔ انہیں اپنے گناہ پر بے حد ندامت ہوئی اور آئندہ کیلئے چوری نہ کرنے کا عہد بھی کیا۔ درحقیقت ندامت بہترین توبہ ہے اور اکثر گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

باپ کا آخری وقت

مسٹر کرم چند گاندھی ناسور میں مبتلا تھے ۱۸۸۵ء کے آخر میں ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ ہزاروں قسم کے علاج ہوئے یہاں تک کہ بمبئی کے سول سرجن کو بھی جو اس زمانہ میں سرجری کے ماہر سمجھے جاتے تھے دکھایا گیا۔ مگر کسی صورت آرام نہ ہوا اور مسٹر کرم چند اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے۔ گاندھی جی اور ان کی والدہ تیمارداری کے فرائض پوری طرح انجام دے رہے تھے۔ روزانہ رات کو گاندھی جی اپنے بیمار باپ کے پیر دبایا کرتے تھے۔ اگرچہ انہیں اپنے باپ سے بیحد محبت تھی اور وہ ان کی خدمت

بڑے شوق سے کرتے تھے لیکن جب تک وہ اس خدمت میں مصروف رہتے تھے اُن کا دل سونے کے کمرے کی طرف لگا رہتا تھا اور اس خیال میں ہمہ تن منتظر ہوتے تھے کہ کب والد کو نیند آئے اور کب یہ چپکے سے اُٹھ کر بیوی کے پاس کمرے میں پہونچ جائیں۔ محود گاندھی جی اس واقعہ کو بے حد ندامت کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

"روز رات کو میرے ہاتھ تو والد کے پیر دبانے میں مشغول رہتے تھے مگر میرا دل سونے کے کمرہ میں لگا رہتا تھا اور وہ بھی ایسے[1] وقت میں جب مذہب۔ طب اور عقل سب کی رو سے جماع کی ممانعت تھی۔"

شرمناک واقعہ

کرم چند جی کی تکلیف بڑھتی ہی رہی۔ یہاں تک کہ سب گھر والے بھی مایوس ہو گئے۔ گاندھی جی کے چچا بھی راجکوٹ آ گئے تھے انہیں اپنے بڑے بھائی سے بیحد محبت تھی۔ ایک روز رات کو تقریباً گیارہ بجے گاندھی جی اپنے باپ کے پیر دبا رہے تھے۔ کہ اُن کے چچا نے کہا۔ جاؤ اب تم سو رہو۔ میں یہاں موجود ہوں۔ گاندھی جی اس اجازت کا روز ہی انتظار کیا کرتے تھے۔ خوشی خوشی اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے وہیں پہونچے جہاں انہیں پہونچنا تھا۔ اور جاتے ہی بیوی کو جگا لیا۔

گاندھی جی کی زندگی کا یہ انتہائی افسوسناک واقعہ ہے۔ ابھی انہیں کمرہ میں پہونچے ہوئے دس پانچ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ نوکر نے آ کر باپ کے انتقال کی خبر سنا دی اور گاندھی جی شہوانی خیالات کے باعث اپنے باپ کے پاس آخری

---

[1] جس زمانہ کا یہ واقعہ ہے۔ گاندھی جی کی بیوی حاملہ تھیں اور زمانہ حمل میں طبی رو سے جماع ممنوع ہے۔

وقت بھی حاضری نہ دے سکے۔ در حقیقت اس لغزش کے خیال نے گاندھی جی کو بہت رلایا ہے اور انہیں آج تک اس شرمناک غلطی کا بے حد احساس ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"شہوانی خواہش نے اس نازک وقت بھی مجھے نہ چھوڑا جب میرے والد جاں بلب تھے اور مجھے ان کی خدمت میں رہنا چاہئے تھا۔ یہ وہ دھبہ ہے جسے میں نہ کبھی مٹا سکا نہ بھول سکا۔ الخ"

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ہی گاندھی جی کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ مگر وہ اتنا کمزور تھا کہ تین چار روز زندہ رہ کر مر گیا۔ اس بچہ کے متعلق گاندھی جی نے جلے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

"میری بیوی نے جو چوہے کا سا بچہ جنا وہ تین چار دن سے زیادہ نہیں جیا۔"

انٹرنس کے بعد

اب سے تقریباً پچاس سال پہلے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا اتنا زور شور نہیں تھا جیسا آجکل ہے۔ تمام کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ علاقوں میں صرف دو جگہ یونیورسٹی کا امتحان ہوتا تھا۔ گاندھی جی راجکوٹ ہائی اسکول میں تعلیم پاتے تھے اس لئے وہ انٹرنس کا امتحان صرف انہی دو مقامات یعنی بمبئی اور احمد آباد میں دے سکتے تھے چنانچہ انہوں نے احمد آباد سے ۱۸۸۷ء میں انٹرنس کا امتحان دیا جب کہ ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔

مسٹر کرم چند کے انتقال کے بعد گاندھی خاندان کی مالی حیثیت زیادہ اچھی نہیں رہی تھی اس لئے آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا سوال قابل غور تھا۔ تاہم گاندھی جی کے بزرگوں نے انہیں بھاؤ نگر کے مشہور ساملداس کالج میں داخل کرا دیا۔ کالج کی تعلیم گاندھی جی

کو بہت ہی مشکل نظر آئی اس لئے تھوڑے ہی دن بعد انہوں نے گھبرا کر کالج چھوڑ دیا اور راجکوٹ واپس آ گئے۔

اسی زمانہ میں ایک پنڈت بزرگ گاندھی جی کے والد مسٹر کرم چند کے دوست تھے۔ انہیں اپنے دوست کے انتقال کے بعد بھی اس گھرانے سے ویسی ہی محبت تھی وہ اکثر گاندھی جی کو تعلیم کے سلسلے میں ہدایتیں کرتے رہتے تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ موہن داس کو بھاؤ نگر کالج بھیج دیا گیا ہے تو وہ گاندھی جی کی والدہ کے پاس پہنچے اور زمانہ کی اونچ نیچ بتا کر یہ مشورہ دیا کہ اب معمولی تعلیم یافتہ ہونا مفید نہیں ہے۔ کرم چند کی گدی سنبھالنے کیلئے ان کے بیٹوں میں سے کسی کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلانی چاہیئے۔ اور چونکہ موہن داس زیر تعلیم ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ بی اے وغیرہ کے خواب دیکھنے سے یہ زیادہ اچھا ہے کہ اسے ولایت بھیجکر قانون کی تعلیم دلا دی جائے۔ تاکہ کسی دن وہ اپنے باپ کی گدی سنبھالنے کے قابل ہو سکے۔

مشورہ اگرچہ معقول تھا لیکن اس میں بہت سی مشکلات بھی تھیں۔ مثلاً انگلستان کے تعلیمی اخراجات کا سوال۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان ویش کا یورپ جیسے آزاد ملک میں اپنے مذہبی احکام کا خیال رکھنا وغیرہ۔ اور ان سب کے علاوہ ماتا کا بے پناہ جذبہ۔ غرض ان ساری باتوں نے گاندھی جی کی والدہ کو عجب کشمکش و پیچ میں ڈال دیا۔ ایک طرف خاندانی گزرادقات کا معاملہ تھا۔ اور دوسری طرف بیٹے کو انگلستان جیسے دور دراز ملک میں بھیجنا وہ بھی اس خطرہ کے ساتھ کہ کہیں وہ انگریزوں جیسا نہ بن جائے۔ اور ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے مذہبی وقار کا خاتمہ کر دے اور سب سے بڑا ڈر ان خاندان والوں کا جن کے نزدیک کسی ہندو کا یورپ کی طرف قدم اٹھانا ہی مذہب سے پھر جانے کے برابر ہوتا ہے۔

ریاست پوربندر سے ناکامی

بہرحال بہت سی گفتگو کے بعد یہ طے ہوگیا کہ گاندھی جی کو انگلستان بھیجدینا چاہیئے مگر ابھی ایک سوال باقی تھا کہ وہاں کے تعلیمی اخراجات کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ اس پر گاندھی جی کے بڑے بھائی نے ریاست پوربندر سے امداد مانگنے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ اُن کے والد پوربندر میں عرصہ تک ملازم رہے تھے اس لئے انہیں اس قسم کی امداد طلب کرنے کا حق تھا۔ چنانچہ گاندھی جی کو پوربندر بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے حالات بیان کرکے مزید تعلیم کی درخواست کریں۔

اس زمانہ میں لیلی صاحب پوربندر کے منتظم تھے۔ انہوں نے تمام حالات توجہ سے سنے مگر کسی قسم کی امداد دینے کا کوئی وعدہ نہیں کیا۔ بلکہ آخر میں نہایت لاپروائی سے گاندھی جی کو جواب دیا کہ پہلے بی۔اے پاس کرو۔ پھر میرے پاس آنا۔ یہ مایوس کن جواب سنکر گاندھی جی راجکوٹ واپس آگئے۔

پنڈت جی نے جو جوشی جی کے نام سے مشہور تھے جب یہ حالات سُنے تو پھر ہمت دلائی اور مستقبل کی ترقیوں کا ذکر کیا۔ آخرکار گاندھی جی کے بڑے بھائی نے ہمت کرکے وعدہ کرلیا کہ وہ انہیں لندن کی تعلیم ضرور دلائیں گے۔ گاندھی جی کے چچا بھی ان دنوں پوربندر میں تھے مگر نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے اس موقع پر امداد کیوں نہ کی البتہ بادل ناخواستہ لندن جانے کی اجازت ضرور دیدی۔

لندن جانے کا خواب

جب گاندھی جی کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ لندن جائیں گے تو انہیں بہت خوشی ہوئی۔ ہروقت اسی خیال میں مگن رہنے لگے۔ ادھر ان کی روانگی کے انتظامات شروع

ہوئے۔ ماں کو اپنے فرماں بردار بیٹے کی طویل علیحدگی کا جتنا بھی احساس ہوتا کم تھا اس لئے وہ ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ جب گاندھی جی نے اُن سے زیادہ رونے کا سبب پوچھا تو وہ بولیں بیٹا مجھے تیری جدائی کا اتنا صدمہ نہیں ہے جتنا وہاں کے حالات کا خوف ہے مجھے ڈر ہے کہ تو ولایت جا کر انگریزوں کی طرح بُرا ہو جائے گا۔ سنتی ہوں وہاں بہت بدچلنی ہے سب لوگ گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں اس لئے اگر تو مجھے اطمینان دلا دے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جائے گا تو میں تجھے خوشی سے رخصت کر دوں۔ ماں کی یہ بات سنکر گاندھی جی نے حتمی وعدہ کیا کہ وہ ماں کے ہر حکم کی پوری طرح تعمیل کریں گے۔

اُس کے بعد ماں انہیں ایک جین سادھو کے پاس لے گئیں جہاں گاندھی جی نے قسم کھائی کہ وہ لندن کے زمانہ قیام میں گوشت اور شراب اور عورت کو اپنے اوپر حرام سمجھیں گے۔ اس قسم کے بعد ان کی ماں کو اطمینان ہوگیا۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ موہن داس کبھی جھوٹی قسم نہیں کھاتا۔

اسکول میں شرمندگی

جب راجکوٹ اسکول کے لڑکوں کو یہ معلوم ہوا کہ موہن داس بیرسٹری کی تعلیم کیلئے لندن جارہے ہیں تو ان میں سے اکثر نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔ اور جلسہ میں انہیں مبارک باد دی۔ ظاہر ہے کہ اس مبارک باد کے جواب میں گاندھی جی کو بھی شکریہ کی تقریر کرنی ضروری تھی۔ مگر وہاں تقریر تو کجا لڑکوں کے سامنے بولتے بھی شرم آتی تھی۔ اس واسطے لڑکوں کے کہنے سننے سے انہوں نے پہلے ہی ایک مختصر سی شکریہ کی تقریر لکھ کر جیب میں رکھ لی تھی تاکہ وقت پر سنا سکیں مگر جب اس کا موقع آیا اور اسٹیج پر کھڑے ہوئے تو تمام بدن کانپنے لگا۔ اور بمشکل تمام وہ

چند الفاظ ادا کرسکے جو وہ پہلے سے لکھ کر اور خوب یاد کرکے لائے تھے۔ اس دلچسپ واقعہ کے متعلق گاندھی جی کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے چند لفظ شکریہ کے لکھ لئے تھے۔ مگر بڑی دقت سے ہکلا ہکلا کر میری زبان سے نکلے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں انہیں پڑھنے کھڑا ہوا تو میرے سر میں چکر تھا۔ اور میں سارے بدن سے کانپ رہا تھا۔"

گاندھی جی کی زندگی میں یہ ان کی سب سے پہلی تقریر تھی۔ ذرا اندازہ کیجئے اس وقت کے موہن داس اور آجکل کے مہاتما گاندھی میں کتنا فرق ہے۔ جو لوگ اپنی کوششوں کو محض اس لئے روک دیتے ہیں کہ کوئی مشکل یا بظاہر ناممکن العمل بات حائل ہو گئی ہے وہ درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہیں اگر اس زمانہ میں گاندھی جی اپنی شرمندگی سے متاثر ہو کر تقریر کو ہوا سمجھ بیٹھتے تو آج کون کہہ سکتا ہے کہ ان کو یہ ترقی نصیب ہوتی۔

لندن کو روانگی

تمام ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر گاندھی جی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ مگر بمبئی پہنچکر معلوم ہوا کہ سمندر میں آجکل بہت جوش ہے اس لئے سفر خطرہ سے خالی نہیں ہے چنانچہ دوستوں کی رائے پر یہ طے پایا کہ یہ سفر کم از کم پانچ مہینے یعنی نومبر تک کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

گاندھی جی کے بھائی اتنے عرصہ تک بمبئی میں کیونکر ٹھہر سکتے تھے لہذا وہ اُن کو اپنے ایک دوست کے پاس چھوڑ کر راجکوٹ واپس آگئے۔ اور ان کا سفر خرچ بھی اپنے ایک عزیز کے پاس بمبئی میں جمع کرا آئے۔ ضروری انتظامات بھی گاندھی جی کے لئے کر دئے تاکہ قیام بمبئی کے زمانہ میں اُنہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

یہ چار پانچ مہینے کا زمانہ گاندھی کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہؤا۔ انہیں ہر وقت انگلستان کا تصور رہتا تھا۔ اور یہ دن کاٹے نہ کٹتے تھے۔

برادری سے خارج

ابھی بمبئی آئے ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک نئی مصیبت آگئی۔ گاندھی جی کی برادری والوں کو جب یہ معلوم ہؤا کہ موہن داس انگریزوں کے ملک میں رہنے کے لئے جا رہا ہے تو وہ لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ کیونکہ اس وقت تک کوئی مودھ بنیا انگلستان نہیں گیا تھا۔ اور یہ لوگ اسے مہا پاپ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ کوئی ہندو انگلستان جا کر اپنے مذہب پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اُسے وہاں انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا پڑتا ہے۔ وہ تمام ممنوع چیزوں کو اچھا سمجھنے لگتا ہے اور دھرم کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتا۔

چنانچہ برادری والوں نے اس خوفناک خطرہ کا احساس کرتے ہوئے ایک جلسہ کیا اور اس میں گاندھی جی کو جواب دہی کے لئے طلب کیا۔ گاندھی جی اگرچہ سوال وجواب کے معاملہ میں صفر سے زیادہ نہ تھے پھر بھی اس جلسہ میں جانے اور جواب پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اور انہوں نے جلسہ میں جا کر برادری والوں کو حتی الامکان یہ اطمینان دلانا چاہا کہ جس خطرہ کا آپ لوگ اندیشہ کر رہے ہیں اس سے میں خوب واقف ہوں۔ اور اسی لئے اپنی والدہ سے ان تمام باتوں کا پوری طرح عہد کر کے روانہ ہو رہا ہوں۔

ہر چند گاندھی جی نے اپنے بھائی بندوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ نہ مانے اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ وہ کسی صورت نہیں مانتے تو اُسی جلسہ میں برادری والوں نے گاندھی جی کو برادری سے خارج کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی برادری کے لوگوں نے عام حکم یہ بھی جاری کر دیا کہ جو شخص موہن داس کو انگلستان کی روانگی کے سلسلے میں کسی قسم کی بھی مدد دیگا اس پر برادری کی طرف سے جرمانہ کر دیا جائے گا۔

اس حکم کا بہت برا اثر ہوا۔ جو لوگ گاندھی جی کو انگلستان روانہ کرنے کے سلسلہ میں کچھ مدد کرتے یا کوئی سہارا دیتے اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کو یہ خیال آیا کہ جب اس کارروائی کی اطلاع راجکوٹ پہونچے گی تو والدہ بھی یقیناً متاثر ہو جائیں گی اور بھائی بھی اس کا اثر لیں گے۔ اس خیال نے گاندھی جی کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ مگر شکر ہے کہ بھائی یا ماں پر اس حکم نے زیادہ اثر نہیں کیا اور وہ بدستور اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ البتہ محسن حضرت کے پاس بمبئی میں گاندھی جی کا سفر خرچ جمع کیا گیا تھا وہ ڈر گئے اور انہوں نے روپے دینے سے صاف انکار کر دیا۔

اس وقت کا یہ انکار بھی گاندھی جی کے سفر کو ملتوی کر دینے کے لئے کافی تھا۔ گاندھی جی کئی دن تک بمبئی میں سخت پریشان رہے۔ آخر سوچتے سوچتے اُن کے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ مسٹر کرم چند (گاندھی جی کے والد) کے ایک دوست بمبئی میں رہتے تھے۔ گاندھی جی ان کے پاس پہونچے۔ اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ انہیں کچھ حالات پہلے سے بھی معلوم تھے۔ وہ بیچارے بہت ہی نیک دل تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کو تسلی دی۔ اور ایک رقم بطور قرض دینے کا وعدہ کر لیا۔

گاندھی جی کو اس وعدہ سے ایک حد تک اطمینان ہو گیا اور وہ نہایت بے صبری کے ساتھ نومبر کا انتظار کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی کو پتہ چلا کہ جوناگڑھ کے ایک مشہور وکیل مسٹر مضمونداری ۴ر ستمبر کو بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وکیل صاحب بھی بیرسٹری کی تعلیم کے لئے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی کے لئے اُن سے بہتر ساتھی اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ فوراً اپنے محسن کے پاس پہونچے اور اُن سے یہ تمام واقعہ بیان کر کے

چاہا کہ انہیں بھی وکیل صاحب کے ساتھ ہی روانہ کر دیا جائے۔

جلدی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گاندھی جی کو برادری کی طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں یہ صاحب بھی برادری سے متاثر نہ ہو جائیں۔ مگر وہ مضبوط ارادہ والے تھے اور انہوں نے گاندھی جی سے وکیل صاحب کی روانگی کا حال سُنکر اس رائے کو مناسب سمجھا بلکہ وہ خود بھی وکیل صاحب سے ملے اور انہوں نے گاندھی جی کی روانگی انگلستان کے سلسلہ میں وکیل صاحب سے درخواست کی کہ سفر میں اِن کی رہبری کریں۔ وکیل صاحب نے بڑی خوشی سے یہ خدمت منظور کر لی۔

بمبئی میں بعض تجربہ کار دوستوں نے گاندھی جی کو انگلستان کی ضروریات کے متعلق ہدایات دیں اور چند ضروری کپڑے جو انگلستان کی رہائش کے لئے ضروری تھے بنوا دیئے۔ ان تمام انتظامات سے مکمل ہو کر مسٹر گاندھی ۴ ستمبر ۱۸۸۸ء کو بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاز کے سیکنڈ کلاس کیبن میں جوناگڑھ کے وکیل مظموندار جی تھے اسی میں احباب نے گاندھی جی کے لئے سیٹ محفوظ کرا دی تھی۔

جہاز کے مسافروں سے شرم

جہاز کے جس درجہ میں گاندھی جی اور اُن کے دوست سوار ہوئے۔ اس میں سوائے اِن دونوں کے باقی تمام مسافر انگریز تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گاندھی جی کا شرم کے مارے کیا حال ہو رہا ہوگا۔ انہیں انگریزی بولنے کی بھی مشق نہ تھی اس کے علاوہ ان لوگوں کے سامنے بیٹھتے بھی شرم آتی تھی۔

ایک مسافر ساتھی کی حیثیت سے اگر کوئی انگریز گاندھی جی سے بات کر بیٹھتا تھا تو اُس کی انگریزی اول تو یہ سمجھ ہی نہ سکتے تھے اس کے علاوہ شرم کے مارے جواب دینا ممکن نہ تھا۔ یا اگر کبھی کسی سوال کا (بشرطیکہ وہ سمجھ میں آگیا ہو) جواب ہی دینا پڑتا

تھا تو اول ایک ایک فقرہ پر خوب غور کرتے تھے پھر اس کی بات کا جواب دیتے تھے۔ مگر وہ جواب ایسا ہوتا تھا جیسے کسی نے نشہ سے چونک کر کچھ کہا ہو۔ اس کیفیت سے انگریز مسافروں کو بہت دلچسپی ہوئی۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہؤا کہ یہ شرمیلے صاحب بیرسٹری پاس کرنے لندن جا رہے ہیں تو اور بھی حیرت میں رہ گئے۔ آپس میں ایک دوسرے سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ جو شخص کسی غیر سے بات کرتے جھجکتا ہو وہ کیا بیرسٹری کرے گا۔

اُن میں سے ایک انگریز سے نہ رہا گیا اور اس نے گاندھی جی کی اس کیفیت سے ایک خاص دلچسپی لینی شروع کی۔ طرح طرح کے سوالات کئے۔ اور بہت ہی مہربانی کے لہجہ میں ان سے دوستی پیدا کرلی۔ رفتہ رفتہ گاندھی جی اس سے مانوس ہو گئے۔ اس انگریز نے گاندھی جی کو انگلستان کی طرز زندگی کے متعلق بہت کچھ سمجھایا اور جب اُس نے یہ دیکھا کہ گاندھی جی انگریزی بولنے سے محض اس لئے شرماتے ہیں کہ وہ صحیح زبان نہیں بول سکتے تو اُس نے کہا کہ غیر زبان میں ہمیشہ ہر شخص غلطیاں کرتا ہے۔ مگر اس کی غلطیاں گرفت کے قابل نہیں ہوتیں اور زبان والے اس پر نہ اعتراض کرتے ہیں اور نہ اس کا خیال کرتے ہیں کہ اس نے کیوں غلط زبان بولی۔ پھر اُس نے اپنے ہندوستانی بولنے کی مثال پیش کی۔ اور کہا کہ اگر میں محض اس خوف سے ہندوستانی نہ بولوں کہ صحیح نہ بول سکونگا تو یقین کیجیے میں ہندوستانی زبان کبھی نہیں بول سکتا تھا۔

ان باتوں سے گاندھی جی کی ڈھارس بندھی اور انہوں نے غلط سلط انگریزی گفتگو کی ابتدا کردی۔ انہیں یقین ہوگیا کہ کثرت استعمال سے غیر زبان پر قابو پایا جاسکتا ہے چنانچہ وہ بھی اس انگریز سے کسی نہ کسی طرح انگریزی میں گفتگو کرنے لگے۔ مگر یہ گفتگو صرف مجمونمدار جی اور اس انگریز دوست تک ہی محدود تھی۔ باقی مسافروں سے اب بھی گاندھی جی شرماتے تھے۔ یہاں تک کہ ساتھی مسافروں کی طرح وہ ڈیک پر ہی نہیں جاتے تھے۔ جہاں عام مسافر تفریح کے لئے جایا کرتے ہیں۔ بے چارے اپنے کیبن میں چھپے بیٹھے رہتے تھے۔

جب ڈیک پر دو چار مسافر ہوتے تو کبھی کبھی بچ بچا کر پہونچ جاتے تھے ورنہ سارا سارا دن کیبن میں گزر جاتا تھا۔

یہی کیفیت کھانے کے معاملہ میں تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ وہ میز پر کھانا بھی نہ کھاتے تھے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ انہیں مسافروں کے ساتھ بیٹھتے شرم آتی تھی اس کے علاوہ میز پر عام طور سے گوشت استعمال ہوتا تھا اور گاندھی جی اپنی والدہ سے گوشت نہ کھانے کا عہد کر چکے تھے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا تھا کھانا بھی اپنے کیبن میں ہی کھا لیا کرتے تھے۔

جب اس انگریز دوست نے اس طرح کیبن میں چھپ کر کھانے کا سبب پوچھا تو انہوں نے نہایت سچائی کے ساتھ سارا واقعہ بیان کر دیا۔ انگریز نے کہا کہ اس طرح مٹھائی اور پھلوں پر انسان کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ تمہیں کافی عرصہ تک انگلستان میں رہنا ہے۔ اور وہاں گوشت کا استعمال کئے بغیر انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ خصوصاً ایسی جگہ جہاں سردی زیادہ ہوتی ہو۔ انسان بغیر گوشت کے گزارہ نہیں کر سکتا۔

گاندھی جی نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اگر میں انگلستان میں بغیر گوشت کھائے گزارا نہ کر سکا۔ تو واپس چلا آؤں گا لیکن یہ ناممکن ہے کہ اپنے مذہب کے خلاف یا والدہ کی اطاعت کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکوں۔ اس کے علاوہ سنا ہے کہ لندن میں ایسے لوگ بھی ہیں جو گوشت سے اہلِ ہنود کی طرح پرہیز کرتے ہیں اور ان کی کوئی ایسی انجمن ہے جو نباتاتی غذا کا پرچار کرتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو آپ یقین کیجئے میں بہت آرام اور اطمینان کے ساتھ انگلستان میں رہ سکتا ہوں۔

بہر حال گاندھی جی نے تمام راستہ جہاز میں گوشت نہیں کھایا بلکہ اپنے ساتھ لائے ہوئے پھلوں اور مٹھائی وغیرہ پر گزارا کرتے رہے۔ اور چونکہ بزرگوں نے وطن سے روانہ کرتے وقت گاندھی جی کو ہدایت کر دی تھی کہ دوران سفر میں اور اس کے

بعد قیام انگلستان کے زمانہ میں وہاں کے معزز لوگوں سے اس بات کی تصدیق کراتے رہنا کہ تم نے "گوشت نہیں کھایا ہے"۔ اس واسطے گاندھی جی نے اس انگریز سے تصدیق نامہ بھی لکھوالیا۔ مگر اس دستاویز کی گاندھی جی کی نظر میں اس وقت کوئی وقعت نہیں رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ایسے تصدیق نامے ان لوگوں کو بھی مل جاتے ہیں جو وہاں ادھر گوشت کھاتے ہیں اور واپسی کے وقت وہاں سے تصدیق نامے حاصل کر لیتے ہیں۔ لہذا انہوں نے کچھ عرصہ کے بعد اس دستاویز کو ضائع کر دیا۔

مضحکہ خیز لباس جہاز میں ہی مسافروں کے مشورہ سے مضمونداری جی نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ لندن کے وکٹوریہ ہوٹل میں قیام کریں گے چنانچہ گاندھی جی نے سنتھمپٹن پہونچتے ہی اپنے دوستوں کے نام تار روانہ کر دئے جن کے نام وہ ہندوستان سے تعارفی خطوط لے کر آئے تھے۔ ان میں ایک صاحب ڈاکٹر پی جے مہتا بھی تھے۔ چنانچہ وہ اسی دن شام کو گاندھی جی سے ملنے کے لئے وکٹوریہ ہوٹل پہونچے اور گاندھی جی کو ہر طرح کا اطمینان دلاتے ہوئے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ مگر وہ یہ دیکھ کر بہت ہنسے کہ گاندھی جی ستمبر کے آخری ایام میں بھی سفید کپڑے[۱] پہن کر لندن آئے ہیں۔

بوکھلاہٹ ڈاکٹر مہتا بیٹھے ہوئے گاندھی جی سے گفتگو کر رہے تھے اور انہیں یورپی آداب مجلس کے طور طریق سمجھا رہے تھے۔ جنہیں سن سنکر گاندھی جی کو کبھی تو تعجب ہوتا تھا اور کبھی انہیں مشکل اور اپنے لئے ناقابل عمل سمجھکر بوکھلا جاتے تھے۔ یہ حالات سنتے سنتے گاندھی جی کے ہاتھ میں قریب رکھا ہوا ڈاکٹر مہتا کا ٹاپ ہیٹ[۲] آگیا اور وہ بے خیالی میں اس ہیٹ پر اس طرح ہاتھ پھیرنے لگے جیسے کوئی بلی کے بچہ کو ہاتھ

---

[۱] انگلستان میں ہر موسم کے لحاظ سے لباس کا رنگ بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے [۲] ایک خاص قسم کا بالوں دار ہیٹ جسے یورپین لوگ رسمی لباس کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

پھیر پھیر کر پیار کرتا ہے۔ اس حرکت سے ہیٹ کے بال اُلٹی طرف کو مڑ گئے۔ ڈاکٹر مہتا نے غصہ اور افسوس کی نظروں سے گاندھی جی کو دیکھا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ اس احساس سے پہلے ہی ہیٹ کا حلیہ بگڑ چکا تھا۔

پندرہ روپے روزانہ

جس ہوٹل میں مسٹر گاندھی اور مجمدار جی نے قیام کیا تھا۔ وہ اگرچہ لندن کے عام ہوٹلوں سے سستا اور آرام دہ تھا پھر بھی تقریباً ایک پونڈ (یعنی پندرہ روپے) روزانہ کا خرچ تھا اور اس کے باوجود گاندھی جی کو مرضی کے مطابق کھانا نہ ملتا تھا۔ اس واسطے وہ بہت پریشان ہوئے اور ہوٹل چھوڑنے کی فکر کرنے لگے۔

دورانِ سفر میں ایک سندھی سے اِن کی ملاقات ہوگئی تھی جب اُسے گاندھی جی کی اس تکلیف کا حال معلوم ہوا تو اُس نے کہا میں اکثر لندن آیا ہوں اور یہاں کے حالات سے خوب واقف ہوں اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں آپ کو علیحدہ مکان کرایہ پر دلادوں۔ گاندھی جی کو اس وقت سب سے بڑی تکلیف کھانے کی تھی وہ فوراً راضی ہوگئے۔ چنانچہ تیسرے ہی دن گاندھی جی مع اپنے دوست مجمدار جی کے اس کرایہ کے مکان میں اٹھ گئے۔ یہ اگرچہ صرف دو کمرے تھے پھر بھی ہوٹل کے گھبرائے ہوئے مسافروں کے لئے کافی تھے۔ کیونکہ یہاں یہ ضروری نہیں تھا کہ کسی مخصوص جگہ سے کھانا خرید کر کھائیں۔ اور منہ مانگے دام ادا کریں۔

رات بھر روتے تھے

ابھی گاندھی جی کو لندن پہونچے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وطن کی یاد ستانے لگی۔ وہاں کی ہر چیز اُن کے لئے نئی تھی رہنے کے طور طریق۔ کھانا پینا۔ ہنسنا بولنا۔ در و دیوار غرض ہر چیز اجنبی اور وطن کی یاد دلانے والی تھی۔ اس لئے چند ہی روز میں ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی۔ گھر والوں کی یاد اور ماں کی محبت کا ہر وقت دل میں خیال رہنے لگا۔ یہاں تک کہ روزانہ ساری ساری رات روتے گزر جاتی تھی۔ مگر لندن جیسی دور دراز جگہ سے محض اس "یاد" کے سبب لوٹ جانا ناممکن تھا اس لئے گاندھی جی بار بار اپنے دل کو سمجھاتے تھے۔ کہ خواہ کچھ ہو بہر حال جس غرض وقت

سے آنا ہوا ہے اُسے تو پورا کرنا ہی پڑیگا۔

مکان بھی چھوڑا

اسی دن شام کو ڈاکٹر مہتا پھر ملاقات کے لئے آئے۔ گاندھی جی نے اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق رہائشی کمرے کو خاصہ سجا لیا تھا۔ مگر ڈاکٹر مہتا نے دیکھ کر کہا کہ اس سادگی سے انگلستان میں گزارہ مشکل ہے۔ اور اگر گزارہ کر بھی لیا تو یہاں کی طرز معاشرت کے متعلق کچھ نہ سیکھ سکوگے۔ اس واسطے میرا خیال ہے کہ تم کسی خاندان کے ساتھ مل کر رہو۔ اور اگر فی الحال یہ مشکل ہے تو میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس پہنچائے دیتا ہوں۔ کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہ کر یہاں کے طور طریق سے واقف ہو جاؤ۔ پھر کسی فیملی میں شریک کردیا جائے گا۔ گاندھی جی اس کے لئے تیار ہو گئے اور ڈاکٹر مہتا نے انہیں اپنے ایک ہندوستانی دوست کے پاس پہونچا دیا۔ یہ صاحب بہت ہی نیک آدمی تھے۔ گاندھی جی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے ساتھ رکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ عرصہ سے انگلستان میں مقیم تھے اور یہاں کے حالات سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کے ساتھ سگے بھائی جیسا برتاؤ کیا۔ اور وہاں کی ضروریات مثلاً انگریزی بولنے کی مشق کرائی۔ لباس کے متعلق ہدایات دیں اور آداب مجلسی کے طور طریق سمجھائے۔

گاندھی جی نے یہاں پہونچ کر تھوڑا بہت سکون تو ضرور محسوس کیا مگر ابھی ایک مشکل باقی تھی اور اس کا حل کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ انگلستان میں بھاجی ترکاری کا سوال بہت ٹیڑھا تھا۔ اول تو کوئی پکانا ہی نہ جانتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کا بچہ بچہ گوشت کا بھوکا ہے۔ اس لئے نباتاتی غذا کا ملنا بہت مشکل تھا۔ اور گاندھی بیچارے بھوکے رہتے تھے۔ مکان کی خادمہ (کھانا پکانے والی) اُن کی کم خوراکی پر ہمیشہ تعجب کرتی تھی سگر اُسے کیا خبر تھی کہ ہندوستان میں ترکاری میں بھی گھی اور مصالحے ڈالے جاتے ہیں وہ تو یہ جانتی تھی کہ مصالحے گوشت کے لئے مخصوص ہیں اور ترکاری کو بغیر نمک کے

صرف پانی میں اُبال کر اس لئے کھایا جاتا ہے کیونکہ اس کے استعمال سے جسم کی نشو ونما کو ترقی دینے والی غذا (حیاتین) وٹامن ملتی ہے۔ لہٰذا وہ گاندھی جی کے لئے روزانہ ترکاری بغیر نمک مرچ اور بغیر گھی کے تیار کر دیتی تھی۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں آدمی کیا کھا سکے گا بے چارے بے زبان گاندھی جی جیسے تیسے دو چار لقمے لے کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

جب ان کے دوست کو یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے بہت سمجھایا اور کہا کہ انگلستان میں ایسے جاہلانہ عہد پر قائم رہنا مشکل ہے اور بغیر گوشت کھائے یہاں گزر نہیں ہوگی اس لئے بہتر ہے کہ تم گوشت شروع کر دو۔ اس نصیحت کے ساتھ انہوں نے گاندھی جی کو ایک کتاب بھی پڑھنے کے لئے دی جس میں گوشت خوری کے فوائد اور انگلستان میں گوشت کھانے کی طبی ضرورت کا حال درج تھا۔

گاندھی جی نے بہت توجہ سے اس کتاب کو پڑھا۔ مگر اُن کے ارادہ میں ذرا تبدیلی نہ ہوئی اور انہوں نے دوست سے نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دیا۔ کہ میں جو عہد ماں کے سامنے کر چکا ہوں وہ اٹل ہے۔ اور میں ہمیشہ اس پر قائم رہوں گا۔ خواہ مجھے کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اس جواب سے وہ دوست جل گئے اور انہوں نے کہا موہن داس! اگر تم میرے سگے بھائی ہوتے تو میں کھڑے کھڑے تمہیں گھر سے نکال دیتا۔

گاندھی جی نے اس سخت جواب کا بُرا نہیں مانا کیونکہ دوست نے یہ بات محض محبت اور اصلاح کے جوش میں کہی تھی۔

بہر حال گاندھی جی اپنے ارادہ پر قائم رہے اور اس کے بعد دوست نے بھی کہنا سننا بند کر دیا۔ لیکن وہ گاندھی جی کی کمزوری اور اس کے نتائج کا احساس کر کے فکرمند رہنے لگے۔

جس مکان میں یہ لوگ رہتے تھے وہ لندن سے بہت دور تھا۔ اور لندن

آنے جانے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ تاہم جیسے تیسے ایک مہینہ سے کچھ زائد وقت گاندھی جی نے اس دوست کے ساتھ گزارا مگر مستقل طور پر لندن سے اتنی دور رہ کر تعلیم حاصل کرنا ناممکن تھا اس لئے ڈاکٹر مہتا اور دوسرے احباب کے مشوروں سے یہ طے پایا کہ لندن میں ہی کسی جگہ قیام کیا جائے۔ چنانچہ ایک دوست نے گاندھی جی کے لئے ایک اینگلو انڈین گھر تجویز کر کے انہیں وہاں ٹھہرا دیا۔ اس مکان میں ایک بیوہ اور اس کی دو لڑکیاں رہتی تھیں گاندھی جی نے آتے ہی اپنے ارادوں کا حال اور گوشت وغیرہ نہ کھا سکنے کی مفصل کیفیت گھر کی مالکہ کو بتا دی گو مالکہ مکان نے ہر قسم کا آرام پہونچانے اور مرضی کے مطابق کھانا تیار کرنے کا وعدہ کر لیا مگر ناواقفیت کے سبب وہ بے چاری ترکاری تیار نہ کر سکی۔ اور یہاں بھی گاندھی جی کو وہی مشکل پیش آئی۔ اکثر بھوکے رہنے لگے۔ مالکہ مکان نے گاندھی جی کی اس تکلیف کو محسوس کیا اور کہا کہ یہاں شہر میں دو ایک ایسے ہوٹل بھی ہیں جہاں نباتاتی غذا تیار ہوتی ہے۔ اور گوشت سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اگر تم ان ہوٹلوں کا پتہ چلا سکو تو یہ پریشانی دور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گاندھی جی روزانہ صبح کو اسکی تلاش میں نکلتے تھے اور بے چارے دس بارہ میل کا چکر کر کے واپس آجاتے تھے۔

مثل مشہور ہے تلاش کرنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر کار ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔ اور فرنگڈن اسٹریٹ میں ایک ایسا ریسٹورنٹ مل گیا۔ جس میں صرف ترکاریاں اور نباتاتی غذائیں تیار ہوتی تھیں۔ گاندھی جی کو اپنی تلاش اور کامیابی سے بے حد مسرت ہوئی اور انہوں نے قیام انگلستان کے زمانہ میں پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

یہ ہوٹل اور اس کے اراکین اس انجمن کے ممبر تھے جو یورپ میں گوشت خوری کو مضر اور نباتاتی غذاؤں کو مفید سمجھ کر اس کا پرچار کرتی ہے۔ اور اسی لئے اس ریسٹورنٹ میں ایسی کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں جن میں انجمن کے مقاصد اور پروپیگنڈہ کی وضاحت ہو۔ چنانچہ گاندھی جی نے بھی یہاں سے کتابیں خریدیں۔ ان کتابوں نے

گاندھی جی کے عقیدہ کو اور زیادہ مستحکم کر دیا۔

گاندھی جی کے دوست اب بھی فکرمند تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر گوشت سے اسی طرح پرہیز رہا تو ایک نہ ایک دن گاندھی جی انگلستان سے گھبرا کر چلے جائیں گے اور تعلیم کا نقصان ہوگا۔ یا جسمانی کمزوری بڑھ جائے گی۔

ایک دفعہ وہ گاندھی جی کو اپنے ساتھ ایک بڑے ریسٹورنٹ میں لے گئے تاکہ انہیں کچھ تجربہ ہو اور یہاں کے لوگوں سے مل جل کر کچھ سیکھیں۔ گاندھی جی ان کے ساتھ چلے تو گئے مگر بعد کو بہت پچھتائے۔

ریسٹورنٹ پہونچکر دوست نے دو آدمیوں کا کھانا طلب کیا اور ایک علیحدہ میز پر گاندھی جی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا آدمی کھانا لے کر آیا۔ ظاہر ہے کہ کیا لایا ہوگا گاندھی جی بہت گھبرائے۔ دوست سے پوچھنے کی تو ہمت نہ ہوئی البتہ ہوٹل کے ملازم کو قریب بلا کر اس سے پوچھا کہ یہ شوربہ کس چیز کا ہے۔ یہ سوال دوست نے بھی سن لیا اور انہیں بے حد غصہ آیا۔ بولے۔ موہن داس تمہیں اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ کسی مہذب جگہ پانچ منٹ بھی گزار سکو۔ اگر تم تہذیب سے اتنی ہی دور رہنا چاہتے ہو تو بہتر ہے یہاں سے نکل جاؤ اور کسی دوسری جگہ اپنی مرضی کا کھانا کھاؤ یا باہر دروازہ پر میرا انتظار کرو۔ گاندھی جی ایک سعادتمند اور فرمانبردار دوست کی طرح چپ چاپ اٹھے اور باہر چلے گئے۔

انہیں معلوم تھا کہ قریب ہی ایک ایسا ہوٹل بھی ہے جہاں "ترکاری" ملتی ہے مگر بدقسمتی سے وہ اس وقت بند تھا۔ چنانچہ گاندھی جی واپس آکر دروازہ پر کھڑے ہو گئے اور دوست کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کے دوست بھی کھانا کھا کر آگئے اور یہ دونوں تھیٹر دیکھنے چلے گئے۔ واپسی پر کھانے کا کوئی وقت نہیں تھا اس لئے تمام رات گاندھی جی بھوکے رہے۔

ہوٹل کے واقعہ سے گاندھی جی کے دوست کو بہت صدمہ تھا۔ وہ گاندھی جی کو

یورپ میں رہنے کے قابل ایک مہذب اور سوسائٹی یافتہ انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ہر کوشش پر ان کی مایوسی بڑھ جاتی تھی۔

گاندھی جی کو اپنے دوست کی اس مایوسی کا احساس تھا۔ اور چونکہ وہ کسی طرح اپنے ہمدرد دوست کو ناراض کرنا نہ چاہتے تھے اس لئے ان کو خوش کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

ناچنے گانے کا شوق

دوست کو خوش کرنے اور اپنے آپ کو مہذب بنانے کے لئے ناتجربہ کار دماغ نے ایک بہت ہی بے تکی اسکیم مرتب کی۔ گاندھی جی نے سوچا کہ اگر انسان گوشت نہ کھائے اور یورپ کے باقی معاملات میں دلچسپی لے تب بھی یورپین سوسائٹی کا کامیاب رکن بن سکتا ہے لہٰذا ایک وایولن پینتالیس روپے میں خریدا گیا۔ اور ناچ سکھانے والی ایک عورت سے گفتگو کر کے معاملہ طے کیا گیا تاکہ وایولن بھی سیکھیں اور ناچ بھی کیونکہ موسیقی اور ڈانس یورپین تہذیب کی جان ہیں۔

ناچ سکھانے والی عورت نے فیس کی پہلی قسط کے پینتالیس روپے دمین پونڈ) لے کر ناچ کی تعلیم دینی شروع کی۔ مگر گاندھی جی کو اس کام میں بہت سی مشکلات نظر آئیں رقاصہ نے ہر چند سمجھایا مگر گاندھی جی کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ جب وہ ڈانس کے لئے انہیں کھڑا کرتی اور یہ بے تکے ہو جاتے تو وہ بہت ناراض ہوتی۔ مثلاً اس نے پیانو بجا کر انہیں ہدایت کی کہ اس کی تال سر پر ڈانس کریں تو یہ کیفیت ہو جاتی کہ پیانو کہیں جا رہا ہے گاندھی جی کے قدم کہیں پڑ رہے ہیں۔ اس عورت نے ہر چند چاہا کہ کسی طرح پیانو کے تال سر ان کی سمجھ میں آجائیں۔ مگر یہ اس کو ہوّا سمجھ چکے تھے کیسے سیکھ سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے رقاصہ کے ہاں جانا ہی چھوڑ دیا اور وہ تین پاؤنڈ بیکار ضائع ہوئے۔

یہی کیفیت غریب وائلن کی ہوئی۔ جب یہ ناچ سے عاجز آگئے اور کسی طرح پیانو کا طرز اُن کی سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے وائلن بجانا آسان سمجھ کر ایک سکھانے والی سے معاملہ کیا مگر یہ تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ وائلن سکھانے والی نے بھی لاکھ سر مارلیا مگر گاندھی جی موسیقی اور ناچ رنگ کیلئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے کیسے سیکھ لیتے۔ ایک دن گاندھی جی نے اپنی استاد سے کہا کہ میں وائلن وغیرہ فضولیات میں پڑکر اصل راستہ سے ہٹا جارہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ ناچ رنگ کے یہ تین مہینے میں نے بالکل بیکار خراب کئے ہیں اس واسطے میں ان فضولیات کو چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میرا وائلن اگر بک سکے تو بکوا دیجئے۔ اب یہ میرے لئے بیکار ہے۔ چنانچہ وائلن وغیرہ فضولیات کو یکلخت علیحدہ کردیا گیا۔

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اُسے خطاوار نہیں کہنا چاہئے اس کے علاوہ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی نے ناچ رنگ میں اس لئے قدم نہیں رکھا تھا کہ یورپ کی عیش پرستیوں میں کھو جائیں۔ درحقیقت اُن کی نیت اپنی اصلاح اور بہبودی کی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ناتجربہ کاری نے کسی غلط راستہ پر ڈال کر عوام کو غلط فہمی میں ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن انصاف سے غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ناچ گانا سیکھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ گاندھی جی اپنی کمزوریوں پر یورپین تہذیب کا پردہ ڈال کر سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل ہو جائیں۔

ان لغویات کو چھوڑنے کے بعد گاندھی جی کو اندازہ ہوا کہ وہ یورپ کی تہذیب اور سوسائٹی سے کس قدر دور رہ گئے ہیں اس واسطے انہوں نے اپنے لباس کو فیشن کے رنگ میں پوری طرح رنگ لیا قیمتی کپڑے بہترین کارخانوں سے سلوائے۔ اور فیشن کے متعلق دوسری ضروریات مہیا کیں۔ مگر یہاں بھی ضمیر نے ملامت کی۔ کیونکہ فیشن کو مکمل کرنے سے خرچ کی زیادتی ہو گئی جو گاندھی جی کی آمدنی سے یقیناً کہیں زیادہ تھی اس لئے حالات نے پھر کوئی نئی اسکیم بنانے پر مجبور کر دیا۔

سفر لندن کا مقصد غائب

واقعات پر غور کرنے کے بعد گاندھی جی نے محسوس کیا کہ وہ جس غرض سے لندن آئے تھے اُسے بالکل بھول کر فیشن پرستی میں پڑ گئے ہیں اور اس کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی نے مستقبل کے راستہ میں کانٹے بچھانے شروع کر دئے ہیں اس احساس نے یہاں تک ترقی کی کہ گاندھی جی نے بیک وقت ان تمام لغویات سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اپنی موجودہ قیام گاہ کے بڑے اخراجات پر غور کرتے ہوئے انہوں نے اُسے بھی چھوڑ دینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ تلاش کے بعد گاندھی جی نے اپنے لئے علیحدہ دو کمرے کرایہ پر لے لئے اور اس طرح فیملی کے ضروری[۱] اخراجات سے بھی ایک حد تک چھٹکارا مل گیا۔

اخراجات کی زیادتی

اس کفایت شعاری سے بھی دل کو سکون نہ ہوا۔ بہرحال جیسے تیسے گاندھی جی نے دوستوں کے مشورہ سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ دوستوں کی رائے ہوئی کہ لندن کی کسی یونیورسٹی سے یہاں کا میٹریکولیشن پاس کر لینا چاہئے۔ مگر یونیورسٹی میں شریک ہونے سے خرچ بہت پڑتا تھا اس لئے ایک پرائیویٹ اسکول میں میٹریکولیشن کی تیاری ہونے لگی۔ فرانسیسی اور لاطینی زبانیں کسی قدر مشکل تھیں۔ اس لئے پہلی بار امتحان میں گاندھی جی لاطینی زبان کی وجہ سے فیل ہو گئے۔ مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دوسرے امتحان پر امیدیں قائم کریں۔ اس عرصہ میں اخراجات نے پھر گاندھی جی کو فکر میں ڈال دیا۔ چنانچہ انہوں نے رہائشی کمروں میں سے ایک چھوڑ دیا۔ اب صرف ایک کمرہ ان کے پاس رہ گیا۔ بازار کا کھانا پینا بھی ترک کر دیا۔ اور یہ انتظام بھی گھر پر ہی کر لیا۔ خود ہی اپنے ہاتھ سے پکانے لگے۔ البتہ

---

[۱] یورپین تہذیب میں کسی خاندان کے ساتھ مل جل کر رہنے سے جوابی تواضع بھی کرنا پڑتی ہے۔ اور اس میں بھی تقریباً ویسا ہی تکلف برتنا پڑتا ہے جو فریق اول نے برتا تھا۔

دوپہر کا کھانا تعلیمی مجبوریوں سے اب بھی باہر ہی کھاتے تھے۔

سادہ زندگی سے وقت میں کافی بچت ہوگئی۔ اور تعلیم میں محنت کرنے کا موقع مل گیا۔ اس سادگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی لندن میٹریکولیشن کے امتحان میں پاس ہوگئے۔

ترکاری کی تبلیغ

اس دوران میں گاندھی جی نباتاتی غذا کے پوری طرح قائل ہوگئے۔ اور اب انہیں یقین ہوگیا کہ صحت جسمانی کے لئے دنیا میں صرف نباتاتی غذا کافی ہے۔ چنانچہ بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تبلیغ بھی کرنے لگے۔ اس زمانہ میں نباتاتی مشرب پر گاندھی جی نے کئی کتابیں بھی پڑھیں۔ یہاں تک کہ ترکاری کی تبلیغ کے لئے ایک نباتاتی انجمن بھی بنا ڈالی جس کا صدر ایک انگریز کو بنایا اور سکریٹری خود ہوگئے۔ یہ گاندھی جی کی پبلک زندگی کا پہلا قدم ہے۔ اور یہیں سے انجمن سازی کا تجربہ شروع ہوا۔

خود انڈے کھاتے تھے

نباتاتی کتابوں اور نباتاتی دوستوں میں اکثر اٹھنے بیٹھنے سے گاندھی جی کو یقین تھا کہ انڈا گوشت سے بالکل علیحدہ چیز ہے کیونکہ اس میں کسی جان کا نقصان نہیں۔ چنانچہ عرصہ تک انڈے کھاتے رہے۔ اگرچہ گاندھی جی کا یہ فعل عہد شکنی کہا جا سکتا ہے اور کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ والدہ سے جو عہد چلتے وقت کیا گیا تھا وہ انڈے کھانے سے ٹوٹ گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی نے غلط فہمی میں ایسا کیا۔ اور انہیں اس وقت تک ہرگز یہ معلوم نہیں تھا کہ انڈا اور گوشت ایک ہی چیز ہے۔ رفتہ رفتہ انہیں غور کرنے کے بعد احساس ہوا کہ جو لوگ گوشت نہیں کھا سکتے انہیں انڈے سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ گوشت سے ہی پیدا ہوتا ہے اس خیال نے انہیں ماں کا عہد یاد دلایا اور انہوں نے انڈے کا استعمال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔

تقریر نہ کر سکے

نباتاتی انجمن جسے گاندھی جی نے شروع کیا تھا اور اس کے سکریٹری بھی تھے روز بروز ہر دلعزیز ہونے لگی۔ بہت سے انگریز اس میں شامل ہو گئے۔ ایک بار اس انجمن کا جلسہ ہو رہا تھا اور ایک اہم معاملہ میں بحث تھی۔ گاندھی جی کو بحیثیت سکریٹری کے اس معاملہ میں بولنا ضروری تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بولے کون؟ اور اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے بات کون کرے۔ اس خیال کے پیش نظر گاندھی جی نے پہلے سے ہی اپنے خیالات ایک کاغذ پر بصورت تقریر لکھ لئے تھے۔ مگر جب بولنے کا وقت آیا۔ اور گاندھی جی اسٹیج پر آئے تو اتنا بھی نہ کر سکے کہ کاغذ جیب میں سے نکال کر ہی لوگوں کو دکھادیں۔ کاغذ جیب میں رہا۔ اور مونہہ میں زبان خاموش۔ صدر جلسہ نے یہ کیفیت دیکھی تو کہا اگر آپ تقریر نہیں کر سکتے اور آپ کے پاس کوئی تحریری تقریر موجود ہو تو لائیے میں خود پڑھ کر سنادوں۔

اب گاندھی جی کی ہمت بندھی اور انہوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ کاغذ جیب سے نکال کر صدر کے حوالہ کر دیا۔ اور انہوں نے کسی شخص سے پڑھوا دیا اسی قسم کا ایک واقعہ دوسری بار وینٹنر میں پیش آیا۔ وہاں کے ایک نباتاتی جلسہ میں گاندھی جی شریک تھے ان سے بھی تقریر کے لئے کہا جا چکا تھا۔ چنانچہ یہ اپنی تقریر لکھ کرے گئے تھے۔ مگر وقت آنے پر اس تقریر کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی تقریر کا ہو چکا تھا۔ آخر کار یہ تقریر بھی گاندھی جی کے ایک دوست کو پڑھنا پڑی۔

تیسری بار اسی قسم کی شرمندگی گاندھی جی کو اس وقت ہوئی جب وہ فارغ ہو کر انگلستان سے ہندوستان واپس آرہے تھے۔ انہوں نے ایک بڑے ہوٹل میں اپنے تمام نباتاتی دوستوں کو دعوت دی۔ دعوت کے بعد اکثر احباب نے تقریریں کیں۔ ظاہر ہے کہ گاندھی جی کو آخر میں تمام احباب کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ مگر وہ جب چند الفاظ کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تو کچھ بھی نہ کہہ سکے۔

لندن میں عشق بازی

آپکو یہ سنکر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ انگلستان ہی نہیں بلکہ تقریباً تمام یورپ میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عشق بازی کرنے میں پوری طرح خود مختار ہیں۔ خود والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد میں عشق کرنے کا مادہ ہو تاکہ وقت پر بر کی تلاش میں دقت نہ ہو وہاں کی ہر نوجوان لڑکی اور لڑکا خود اپنے لئے محبوب تلاش کرتا ہے اور اس سے محبت کی پینگیں بڑھاتا ہے۔

مغربی تہذیب میں یہ عشق بازی جزو زندگی سمجھی جاتی ہے۔ ہر کنواری لڑکی ایک عاشق رکھتی ہے اور اس طرح ہر غیر شادی شدہ لڑکا بھی یقیناً ایک نہ ایک محبوبہ کا عاشق ہوتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو اسے جاہل اور غیر مہذب سمجھ کر سوسائٹی میں اس کی کوئی وقعت نہیں کی جاتی۔

یہ محبت عموماً اسکول کی زندگی سے شروع ہو کر شادی کے وقت تک اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ عرصہ تک رہتی ہے۔ البتہ وہاں تعلیمی زندگی اور شادی شدہ زندگی میں بہت بیر ہے۔ کافی تلاش کرنے کے باوجود آپ کو ایسی مثال نہ مل سکے گی۔ کہ کوئی نوجوان لڑکا یا لڑکی شادی شدہ ہونے کے باوجود تعلیم حاصل کر رہا ہو یا کر رہی ہو۔ اس کے خلاف ہندوستان میں یہ دونوں زندگیاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو دونوں ایک ساتھ شروع ہو کر ایک ہی ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہیں مگر یہ بات یورپین ملکوں میں عیب شمار کی جاتی ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے وہ طالب علم جو شادی کے بعد اعلےٰ تعلیم کیلئے انگلستان پہنچتے ہیں اپنے آپ کو کنوارا ظاہر کرتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اُن کی ازدواجی زندگی کا راز فاش ہو جائے تو پہلا نقصان تو بدنامی کا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ پھر کوئی نوجوان لڑکی ایسے شخص کی طرف مخاطب بھی نہیں ہوتی۔ اور یہ بے چارا مغربی زندگی کے باوجود اپنے آپ کو سوسائٹی کی

آنکھ کا تنکا ہی سمجھنے پر مجبور رہتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں انگلستان کی لڑکیاں بہت سیدھی سادی اور بھولی ہوتی تھیں۔ اور ہندوستانیوں کو اس حقارت سے نہ دیکھتی تھیں جیسی آج کل کی یورپین لڑکیاں کالے آدمی کو ناقابل التفات اور ذلیل سمجھتی ہیں۔

اُس زمانہ میں ہندوستانی طالب علم بھی انگلستان میں زیادہ نہ تھے اور جو بھی تھے وہ سب اپنے آپ کو کنوارا ہی بتاتے تھے۔ مگر یہ تقریباً ستر فی صدی غلط تھا ان میں آدھے سے زیادہ شادی شدہ تھے۔ مگر عشقیہ مصلحت کی بنا پر وہ اپنے آپ کو کنوارا ہی ثابت کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ سب کے سب مغربی نوجوان لڑکیوں سے عشق بازی کرنے میں پوری طرح آزاد تھے اور کرتے تھے۔

عشق کا روگ لگ گیا

ایک ایسے ملک میں جہاں شادی شدہ طالب علم کو بہت برا سمجھا جاتا تھا ظاہر ہے کہ گاندھی جی کیلئے بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ جھوٹ بولنے کے وہ سخت مخالف تھے اور اگر اپنا شادی شدہ ہونے کا راز فاش کر دیں تو لندن میں مسرت کے ساتھ رہنا مشکل تعلیم ادھوری رہ جاتی۔ مجبوراً گاندھی جی بھی اسی حمام میں عریاں ہو گئے جہاں سبھی سب عریاں تھے۔ اور بے تکلف اپنے آپ کو غیر شادی شدہ بتانے لگے۔

یہ وہ جھوٹ تھا جسے گاندھی جی نے ضمیر کی انتہائی ملامتوں کے باوجود عرصہ تک جاری رکھا اور یہی وہ خطرناک جرم تھا جس نے گاندھی جیسی کٹر اور بلند اخلاق ہستی کو بھی مغربی عشق کا روگ لگا دیا۔

جس خاندان کے ساتھ گاندھی جی ونٹیز میں مقیم تھے ان کے ہاں دستور تھا کہ ان کی نوجوان کنواری لڑکی مہمانوں کی دلنوازی اور خاطر تواضع کے فرائض اپنے

ذمہ لیتی تھی۔ چنانچہ گاندھی جی بھی بارہا اسی خاندان کی ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ سیر تفریح اور بائسکوپ وغیرہ گئے مگر فطری شرم نے اس لڑکی سے زیادہ بے حجاب نہ ہونے دیا یہ لڑکی بے حد شوخ تھی اور قدم قدم پر گاندھی جی سے صاف ستھرا مذاق کرتی تھی۔ مگر گاندھی جی شرم کے مارے اس سے بات نہ کر سکتے تھے۔ اسی شرم نے انہیں اس لڑکی سے بچائے رکھا۔ ایک دفعہ یہ لڑکی گاندھی جی کو ایک بہت اونچی پہاڑی پر لے گئی۔ یہ بے چارے جسم کے ہمیشہ سے کمزور ہیں بڑی دقت سے پہاڑ پر اس کا ساتھ دے سکے۔ اور جب وہاں سے اترے تو اکثر جگہ پھسل گئے۔ اس پر لڑکی نے بہت مذاق اڑایا۔ اور بے تکلفی کا اظہار کیا۔ مگر گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

نوجوان لڑکی سے دوستی

البتہ ایک بار قیام برائٹن[۵۱] کے زمانہ میں گاندھی جی ایک دفعہ ہوٹل میں کھانا کھانے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات ایک امیر بیوہ سے ہوگئی۔ گاندھی جی فرانسیسی زبان سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر جب ہوٹل میں فرانسیسی زبان کی ضرورت ہوئی تو اسی بیوہ نے گاندھی جی کی رہنمائی کی اس کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے دوست ہوگئے۔

یہ عورت بھی خاص لندن کی رہنے والی تھی۔ گاندھی جی سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اس نے انہیں اپنے ہاں ہر اتوار کی دعوت کے لئے مدعو کیا۔ گاندھی جی نے بخوشی یہ دعوت منظور کر لی۔ بیوہ عورت گاندھی جی کی غذا کے متعلق سب کچھ جان گئی تھی لہٰذا اس نے ہر دعوت میں نباتاتی غذاؤں کا انتظام کر دیا۔ اور گاندھی جی ہر اتوار کو لندن میں اس کے مکان پر جانے لگے۔ یہ عورت اگرچہ گاندھی جی کی دوست تھی اور انہیں مغربی تہذیب و تمدن کے متعلق سبق دیا کرتی تھی۔ مگر ہندوستانی نقطہ نظر سے وہ گاندھی جی کے مستقبل

[۵۱] برائٹن بھی وینٹنر کی طرح انگلستان میں ایک صحت گاہ ہے۔

کو خراب کر رہی تھی۔ اُسے بھی یہ غلط فہمی تھی کہ گاندھی جی غیر شادی شدہ ہیں۔ لہٰذا اس نے گاندھی جی کی دل جوئی کے لئے اپنے ہاں ہر اتوار کی دعوت پر نوجوان عورتوں کو بھی بُلانا شروع کیا۔ اِس عورت کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ گاندھی جی اس لڑکی سے مانوس ہو گئے اور اُس کی گفتگو میں مٹھاس محسوس کرنے لگے۔

بڑھتے بڑھتے یہ احساس اتنا ترقی کر گیا کہ گاندھی جی کو ہر وقت آنے والی اتوار کا انتظار رہنے لگا۔

شوخ لڑکی کی وہ دلچسپ چھیڑ چھاڑ۔ اُس کی برق پاش مسکراہٹیں اس کی بے پناہ سادہ محبت اور شوخ باتیں یہ وہ چیزیں تھیں جس نے گاندھی جی کو عشق کی لاعلاج[۱] بیماری میں مبتلا کر دیا اور وہ بھی اس سے بے تکلفانہ گفتگو کرنے لگے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جتنے عرصہ بھی عشق کا یہ ڈرامہ کھیلا جاتا رہا۔ شہوانی ہوا اس طرف سے نہ گزر سکی۔

محبت سے استعفےٰ

اول اول تو گاندھی جی کو اس چھیڑ چھاڑ میں بہت مزا آیا۔ اور انہیں اس لڑکی سے انسیت ہو گئی۔ مگر جب کبھی اپنی شادی شدہ زندگی کا خیال آ جاتا تھا تو طبیعت پر ایک اوس سی پڑ جاتی تھی بالخصوص اپنی جھوٹی زندگی کا احساس کر کے انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی اور یہ تکلیف یہاں تک بڑھی کہ وہ اس جھوٹی محبت سے استعفےٰ دینے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے سوچا کہ کسی معصوم کو جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا کر کب تک ضمیر کا خون کیا جا سکے گا اس لئے بہتر ہے کہ اپنے شادی شدہ ہونے کا راز فاش کر دوں۔

آخر کار ایک دن خوب غور کرنے کے بعد گاندھی جی نے برائٹن سے اپنی بیوہ

---

[۱] گاندھی جی کا یہ عشق لاعلاج ثابت نہیں ہوا کیونکہ خود انہوں نے دیکھتے دیکھتے چند منٹ میں اس کا علاج کر لیا اور تندرست ہو گئے۔

دوست کے نام مفصل خط لکھ کر ظاہر کر دیا کہ وہ اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں یہ محض تعلیمی مصلحت اور قیام انگلستان کے لئے ضروری سمجھ کر۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شادی شدہ ہی نہیں بلکہ ایک بچہ کے باپ بھی ہیں۔

اس تحریر کے ساتھ ہی گاندھی جی نے نہایت عاجزی کے ساتھ اس خاتون سے اپنی لغو گوئی کی معافی بھی مانگی۔

لندن میں جس وقت یہ خط بیوہ دوست کو ملا تو وہ بہت ہنسی اور اس نے فوراً ہی جواب لکھا کہ آپ کی اس دلچسپ حرکت سے ہمیں کوئی رنج نہیں ہوا۔ مگر آپ کی بچپن کی شادی کے خیال سے ہمیں بڑی حیرت ہوئی آپ آئیندہ اتوار کو ضرور آئیے گا تاکہ آپ کی دلچسپ اور عجیب وغریب شادی کے حالات سن سکیں۔

ان واقعات کے بعد بھی گاندھی جی عرصہ تک اس دعوت میں شریک ہوتے رہے اور اس کے بعد جب کبھی ضرورت پڑی انہوں نے بے تکلف اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

گاندھی جی پر مذہبی حملہ

اسی دوران میں گاندھی جی کی دوستی چند عیسائی لوگوں سے ہو گئی جن کا تعلق خیرات سے تھا۔ اور انہوں نے گاندھی جی کو عیسائیت کی خوبیاں بتانا شروع کیں۔ عیسائی مذہب کے متعلق بہت سی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ گاندھی جی نے ان کتابوں کو بھی پڑھا اور عیسائی مبلغوں کی تقریریں بھی سنیں مگر اس کوشش کا الٹا اثر ہوا۔ کیونکہ عیسائی تعلیم کے نقائص سے ان کا دل افسردہ ہو گیا اور وہ اس مذہب سے اور بھی بدظن ہو گئے۔ مگر ایک نئی بات گاندھی جی میں پیدا ہو گئی۔ انہیں دنیا کے مختلف مذاہب کے مطالعہ اور چھان بین کا شوق ہو گیا۔ اسی سلسلہ میں چند اسلامی تاریخ کی کتابیں بھی انہوں نے پڑھیں اور انہیں پیغمبر اسلام

کی شاندار زندگی کے حالات کا علم ہوا۔

نئے مذہب کی تعمیر مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد گاندھی جی ایک نئے رنگ میں اپنے آپ کو محسوس کرنے لگے۔ انہیں ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ اچھی باتیں بھی نظر آئیں اور انہوں نے سوچا کہ ہر مذہب کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کرکے کسی اچھے عقیدہ اور صحیح راستہ کی تلاش ہر سمجھدار انسان کے لئے ضروری ہے۔ اور ان پر مدت تک یہی دھن سوار رہی اس زمانہ میں ایک دوست کے مشورہ پر انہوں نے بھاگوت گیتا کا مطالعہ کیا تو انہیں اس کتاب میں وہ خوبیاں نظر آئیں جن کی انہیں تلاش تھی۔ اس واسطے عقیدہ کا زیادہ رجحان ہندو مذہب کی طرف رہا جس پر وہ آج تک سختی کے ساتھ قائم ہیں۔

پھر ایک نوجوان عورت

۱۸۹۰ء کے وسط میں مشہور بندرگاہ پورٹ اسمتھ میں ایک کانفرنس ہونے والی تھی گاندھی جی اور ان کے نباتاتی احباب بھی اس کانفرنس میں مدعو تھے۔ چنانچہ یہ لوگ وقت مقررہ پر پورٹ اسمتھ پہونچے کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی نے انہیں ایک ایسے مکان میں ٹھہرا دیا جس میں خود مالکہ مکان رہتی تھی۔

واضح رہے کہ اس زمانہ میں پورٹ اسمتھ کی آبادی میں بیشتر حصہ ایسی عورتوں کا تھا جن کے اخلاق عام یورپ سے کہیں زیادہ مغربی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور وہ نہایت آزادی اور مکمل خواہش کے ساتھ غیر مردوں سے دوستی کرکے بلا کسی لالچ کے بھولے بھالے مردوں کو اپنا ضرورت مند بنا دیا کرتی تھیں۔

اتفاق سے گاندھی جی اور ان کے ایک دوست بھی ایسے ہی مکان میں ٹھہرائے گئے جہاں مالکہ مکان تنہا رہتی تھی اور اس پر مغربی آزادیاں پوری طرح مسلط تھیں۔ رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد یہ دونوں مرد اور مالکہ مکان تاش کھیلنے بیٹھ گئے تھوڑی

دیر کے بعد گاندھی جی کے دوست اور اس عورت میں کچھ بے تکلفی ہوگئی اور اس نے دوسری صورت اختیار کر لی۔

گاندھی جی کو اس ماحول سے شرم محسوس ہوئی۔ مگر شباب کے دیوتا نے اس شرم کو اپنی آغوش میں لے کر گاندھی جی کو کچھ اور آگے بڑھا دیا۔ ان پر بھی یہ رنگ غالب آ چلا۔ اور وہ بھی اس مخش مذاق میں حصہ لینے لگے۔ وقت اور حالات نے یہیں بس نہیں کیا بلکہ گاندھی جی کو اس سے بھی آگے بڑھنے کی دعوت دی۔ اور وہ تاش پھینک پھاند کر اخلاقی حدود سے آگے بڑھنے والے ہی تھے کہ ان کے ساتھی (دوست) نے بروقت انہیں ہدایت کی اور پوچھا مسٹر گاندھی! تم میں کہاں سے یہ شیطان سما گیا۔

شرم سے پسینہ آگیا

دوست کے یکایک ٹوک دینے سے گاندھی جی کو اپنی سخت غلطی کا احساس ہوا اور انہیں شرم کے مارے پسینہ آگیا۔ فوراً ہی انہیں اپنے اُس عہد کا خیال بھی آیا جو انہوں نے والدہ کے سامنے کیا تھا۔ کہ وہ کبھی غیر عورت کی طرف مخاطب نہ ہوں گے چنانچہ وہ تاش کی میز سے انتہائی ندامت کے ساتھ اٹھ کر سیدھے اپنے کمرے میں پہونچے۔ اُس وقت اُن کے دل و دماغ میں کس قدر ہیجان تھا اس کا اندازہ خود گاندھی جی کے الفاظ سے کیجئے۔

"میں شرم سے پانی پانی ہوگیا میں نے اس تنبیہ پر عمل کیا اندر دل ہی دل میں اپنے دوست کا بہت شکر گزار ہوا مجھے وہ عہد یاد آگیا جو میں نے اپنی ماں سے کیا تھا۔ اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس شکار کی طرح جو شکاری سے بچ کر بھاگا ہو۔ ہانپتا کانپتا اپنے کمرہ میں پہونچا میرا بند بند لرز رہا تھا۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر میرے دل میں شہوانی خواہش ہوئی۔"

اس دن ساری رات گاندھی جی کو اس افسوسناک جرم کا احساس رہا۔ وہ بار بار اپنی اس لغزش پر ملامت کرتے تھے اور بروقت تنبیہ ہو جانے پر خدا کا شکر کرتے تھے۔ جرم کا تصور اتنا بھیانک تھا کہ انہوں نے پورٹ اسمتھ سے فوراً واپسی کا ارادہ کر لیا۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی کی ملاقات ہندوستان کے مشہور گجراتی مصنف مسٹر نرائن ہیم چندر سے ہوئی جو ان دنوں سیاحت اور مغربی مصنفوں کی ملاقات کے لئے لندن گئے ہوئے تھے۔ ان سے گاندھی جی کی دوستی ہو گئی۔ اس دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مسٹر ہیم چندر بھی گاندھی جی کی طرح نباتاتی تھے۔ اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے کے غذائی دوست بن گئے۔ بہت دن تک ان دونوں کا لندن میں ساتھ رہا اس کے بعد وہ سیاحت فرانس وغیرہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ اسی سال گاندھی جی نے بھی فرانس کے مشہور شہر پیرس کی سیر کی۔

بیرسٹری کا امتحان

بیرسٹری کا امتحان لندن میں اگرچہ آج کل کچھ سہل ہے مگر اب سے پچاس برس پہلے یہ بہت ہی دلچسپ سمجھا جاتا تھا۔ ہر امتحان دینے والے کو لاتعداد دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا تھا اور ان کی فیس بھی جبریہ ادا کرنا پڑتی تھی۔ ان دعوتوں میں عموماً شراب اور گوشت بکثرت استعمال ہوتا تھا اس لئے گاندھی جی ایسی دعوتوں میں کیونکر شریک ہوتے۔ اور اگر ہوتے بھی تھے تو محض تماشہ دیکھ کر بھوکے واپس آنے کے لئے۔

بہرحال جیسے تیسے قانون کی تعلیم پر انہوں نے تھوڑی بہت توجہ دی اور چونکہ امتحان بہت آسان ہوتا تھا اس لئے آسانی کے ساتھ بیرسٹری پاس کر لی۔

واپسی اب گاندھی جی کے لئے انگلستان میں کوئی کام نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے واپسی کے انتظامات شروع کر دئے۔ ۱۰ ارجون ۱۸۹۱ء کو بیرسٹری کی سند لیکر ۱۲ ارجون ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔

بمبئی میں بحر ہند میں چونکہ جون جولائی میں طوفانی حالت ہوتی ہے اس لئے گاندھی جی کا یہ پورا بحری سفر طوفان میں ہی گزرا مگر اب جہاز کا سفر ان کے لئے نئی بات نہیں رہی تھی اس : اسلئے تمام راستہ آرام سے گزرا۔ اور بخیریت بمبئی کے بندرگاہ پر آپہونچے۔

احباب سے ملاقات بندرگاہ پر گاندھی جی کو ان کے بڑے بھائی ملے۔ بھائی نے بہت دن کے بعد بھائی کو دیکھا تو محبت کا ایک عملی نظارہ سامنے آگیا۔ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے۔ ایک دوسرے کی خیریت پوچھی گئی۔ اور اس کے بعد گاندھی جی اور ان کے بھائی ڈاکٹر مہتا[۱] کے مکان پر پہونچے۔ جہاں ان کا بے صبری سے انتظار کیا جارہا تھا۔ ڈاکٹر مہتا نے اپنے دوست کی بہت خاطر مدارات کی اور انگلستان کے بقیہ حالات پوچھے۔

دردناک خبر یہاں پہونچکر گاندھی جی کو بتایا گیا کہ ان کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے یہ سنتے ہی گاندھی جی کا چہرہ زرد پڑگیا۔ خدا جانے وہ کیا کیا امیدیں باندھ کر انگلستان سے چلے ہوں گے۔ مگر ماں کی یکایک موت نے ان کی ساری حسرتوں پر پانی پھیر دیا۔ درحقیقت گاندھی جی کو اپنی ماں سے غیر معمولی محبت تھی اور یہی حال ماں کا تھا مرتے مرتے وہ اپنے موہن داس کی یاد کو نہ بھول سکیں۔ آخر وقت بھی موہن داس کا ہی نام ان کی زبان پر تھا۔ مگر گاندھی جی کے بڑے بھائی نے انگلستان صرف اس لئے خبر نہ بھیجی تھی کہ اس خبر سے گاندھی جی کی طبیعت تعلیم کی طرف سے اچاٹ ہوجاتی۔ اور عجب نہیں وہ پریشان ہوکر بے سروسامان واپس آجاتے۔

بہرحال جیسے تیسے گاندھی جی نے اس غم کو برداشت کیا جب انسان پر مصیبت

---

[۱] ڈاکٹر مہتہ گاندھی جی سے پہلے ہی لندن سے ہندوستان آگئے تھے۔ اور بمبئی میں رہتے تھے۔

آ ہی جاتی ہے تو وہ اُسے اتنا برہم نہیں سمجھتا جتنا اس کی آمد سے پہلے اسے موہمناک سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر مہتا نے بمبئی میں گاندھی جی کو بہت سے دوستوں سے ملایا۔ اور آئیندہ کے لئے بہت سے منصوبے تجویز کئے۔ ان احباب میں خاص طور پر قابل ذکر ملاقات ڈاکٹر مہتا کے ایک قریبی عزیز رائے چندجی کی ہے جو اپنے زمانہ کے اچھے شاعروں میں سے تھے اُن کا مذہبی تقدس مشہور تھا اور قابلِ غور معلومات بھی بہت وسیع تھی۔ ان کی صحبت میں گاندھی جی کو بہت دلچسپی ہوئی۔ اور ایک حد تک ان کی مذہبی معلومات میں بہی اضافہ ہوُا۔

گاندھی جی اِن کی مذہبیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ انہیں رائے چندجی کی تعلیم میں مکمل عرفان آلہی کا احساس تھا اور وہ اُنہیں بہت اہم ہستی خیال کرتے تھے لیکن پھر بھی گرو ماننے میں گاندھی جی کو تساہل ہوُا۔ اور یہ تساہل آج تک ہے۔ مگر بقول گاندھی جی کے انہیں اب بھی گروُ کی تلاش ہے۔ بشرطیکہ وہ گاندھی جی کے مقرر کردہ سچے معیار پر پورا اُترے۔

پھر راجکوٹ میں کچھ دن بمبئی ٹھہرنے کے بعد اپنے وطن راجکوٹ واپس آگئے۔ یہاں برادری والوں میں اب بھی اُن کے خلاف انتقامانہ جذبہ موجود تھا۔ اگرچہ اس میں ایک حد تک کمی ہوگئی تھی اور کچھ لوگ گاندھی جی کے اس قصور کو معاف کرچکے تھے مگر پھر بھی آدھے سے زیادہ آدمی مخالف تھے۔

اس موقع پر گاندھی جی نے بہت دانشمندی سے کام لیا۔ جن لوگوں نے واپسی پر گاندھی جی کی مخالفت کی۔ یا جنہوں نے کوئی شورش پیدا کی۔ ان کا جواب گاندھی جی نے مکمل خاموشی سے دیا۔ رفتہ رفتہ مخالفت کا جوش ٹھنڈا ہوگیا اور وہی لوگ جو کل تک سخت مخالف تھے دوست نظر آنے لگے۔

سارا گھر انگریز ہو گیا

انگلستان سے واپس آنے پر یہ کیونکر ممکن تھا کہ گاندھی جی اس ہندوستانی تمدن کو برقرار رہنے دیتے جسے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ باتیں جو کبھی گھر کے روزمرہ میں شامل تھیں آج عجیب اور مہمل معلوم ہونے لگیں۔ غذاؤں میں بھی تبدیلی ہوئی۔ اور لباس بھی سارے گھر کا نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔

اخراجات کی کثرت

نئی تہذیب کی ان وست درازیوں نے گھر کے اخراجات کو یکلخت دوگنا کر دیا آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ اور پہلے ہی کسی قدر تنگی سے گزر کی جاتی تھی مگر انگلستان کے اس تمدنی دیو نے اخراجات کو اور بھی بھیانک بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ یہ شوق بغیر مستقل آمدنی کے کیونکر قائم رہ سکتا تھا۔ آخر کار نتیجہ وہی ہوا جو ان حالات میں ہونا چاہیئے تھا۔ خرچ کی زیادتی نے قرض کی صورت اختیار کر لی یہ حالات دیکھ کر گاندھی جی اور ان کے بڑے بھائی کو بہت فکر ہوئی اور آمدنی بڑھانے کے ذرائع تلاش ہونے لگے۔

بیرسٹری بیکار

گاندھی جی کے بھائی نے اپنے وسیع حلقۂ احباب میں گاندھی جی کو بیرسٹری شروع کرانے اور مقدمے دلانے کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ خود گاندھی جی اپنے پیشہ کے شروع کرنے سے بہت ڈرتے تھے انہیں یقین تھا کہ ان کی قانونی قابلیت اتنی بھی نہیں جتنی ایک بہت ہی معمولی وکیل کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فطری شرم بھی انہیں مایوس کر رہی تھی۔ مقدمہ کا خیال آتے ہی ان کے سامنے عدالت کا بھیانک تصور اور وہاں بولنے کا خطرناک کام یاد آ جاتا تھا۔ اور وہ اس دہشت میں مبتلا ہو جاتے تھے کہ عدالت کے سامنے کیونکر بات کر سکوں گا۔

مقدمے واپس ہو گئے

بہرحال بھائی کی کوششیں راجکوٹ میں بدستور جاری تھیں۔ اور ان کے باعث کبھی نہ کبھی ایک آدھ مقدمہ گاندھی جی کے پاس آجاتا تھا لیکن جب گاندھی جی اپنی فیس طلب کرتے تھے تو وہ بعض اوقات اتنی زیادہ اور مضحکہ خیز ہوتی تھی کہ موکل واپس چلا جاتا تھا۔

بیوی پر جھنجلاہٹ

انگلستان سے واپسی پر بھی بہت دن تک گاندھی جی کا دل بیوی کی طرف سے صاف نہ ہوا۔ وہ اکثر بددل رہتے تھے۔ اور جب آمدنی کے ذرائع بند ہوئے اور موکل واپس جانے لگے تو گاندھی جی کا یہ غصہ بیشتر اپنی بیوی پر اترتا تھا۔ بلکہ ایک دفعہ تو یہاں تک نوبت پہونچی کہ انہوں نے اپنی بے گناہ بیوی کو اس کے میکے بھیجدیا اور عرصہ تک اس غریب کو پریشان رکھا۔

بمبئی چل دئے

راجکوٹ کی بے کیفی اور بیکار زندگی سے عاجز آکر گاندھی جی اپنے بھائی کے مشورہ سے بمبئی چلے گئے تاکہ وہاں روزانہ ہائیکورٹ جاکر مقدمے سنیں اور کچھ بولنے اور سمجھنے کا مادہ پیدا ہو۔ بحث کرنے کے طریقے اور مقدموں میں باریکیاں پیدا کرنا آجائیں۔

وکالت کا پہلا مقدمہ

بمبئی پہونچکر گاندھی جی روزانہ ہائی کورٹ میں جاتے اور وکیلوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھتے مگر عرصہ تک روزانہ جانے کے باوجود ایک بات بھی ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ انہیں ہر مرتبہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وکیل اور بیرسٹر لوگ کیونکر اتنی بڑی عدالت میں اور اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے بات کر لیتے ہیں اور پھر کیسی دلیری سے بولتے ہیں ان مایوس کن خیالات نے گاندھی جی کی ہمت اور بھی پست کر دی۔ اور وہ وکالت کے پیشے کو ہوا سمجھنے لگے مگر احباب کی کوششیں برابر جاری تھیں۔ ایک دوست نے کہا کہ بیرسٹر کو تعلیم سے فارغ ہونے کے

بعد چار پانچ برس خالی بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ گاندھی جی کو اس سے کوئی اطمینان نہیں ہوا، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ بمبئی میں ایک بیرسٹر کی طرح زندگی گزارنے کے لئے اخراجات کی بہت ضرورت تھی اور ان کا پورا ہونا موجودہ بیکاری میں یقیناً مشکل تھا۔ اس واسطے دوستوں نے کوشش کر کرا کے کہیں سے ایک مقدمہ دلوا دیا۔

عدالت میں کچھ نہ بول سکے

گاندھی جی کو یہ مقدمہ پاکر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ایک عورت کا مقدمہ تھا اور اس سے تیس روپے محنتانہ کے وصول کرتے۔ اس کے بعد مقدمہ کے پورے حالات اس عورت سے سمجھے تاکہ عدالت کو مقدمہ سمجھا کر بحث کر سکیں۔ مگر جب عدالت میں پہونچے اور مقدمہ پیش ہوا تو گاندھی جی عدالت کا مونہہ تکنے لگے ہر چند بولنا چاہا مگر زبان نے کام نہ دیا۔ اس پر عدالت اور دوسرے حاضرین حیرت میں رہ گئے۔ اس دلچسپ حقیقت کا لطف گاندھی جی کے بیان سے اٹھایئے۔ آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں کھڑا ہوا لیکن میرا دل بیٹھ گیا۔ میرے سر میں چکر تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ساری عدالت گھوم رہی ہے۔ میری سمجھ میں کوئی سوال نہیں آیا جو میں پوچھتا۔"

گاندھی جی اس یکایک شرمندگی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہیں اس وقت نہ اپنی توہین کا خیال تھا نہ بدنامی کا وہ عدالت سے ایک منٹ کی دیر لگائے بغیر پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے موکل کو وہیں ہدایت کی کہ میں پیروی نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے فیس واپس لو اور کسی دوسرے کو وکیل کر لو۔

چنانچہ ایک دوسرے وکیل مسٹر پٹیل نے اکیاون روپے فیس لے کر اس مقدمہ میں اپنا وکالت نامہ شامل کر دیا گاندھی جی نے اس کام سے فارغ ہو کر سیدھے گھر کی راہ لی۔ انہیں اس شکست کا بے حد صدمہ تھا۔ اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک بولنے

کی قابلیت پیدا ہوگی کوئی مقدمہ نہیں لیں گے۔ چنانچہ اس مقدمہ کے بعد انہوں نے سوائے عرضداشتیں لکھنے کے عدالت کا کوئی کام نہیں لیا۔

اسکول میں ماسٹر

گھر کے اخراجات اور اپنے ذاتی خرچ نے گاندھی جی کو بہت متفکر کر دیا تھا۔ ایک بار انہوں نے کسی اخبار میں اشتہار دیکھا کہ کسی اسکول میں ۷۵ روپیہ ماہوار پر ایک ٹیچر کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی نے بھی اس کے لئے درخواست دی۔ افسر نے انہیں ملاقات کے لیے بلایا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ گاندھی جی بی اے پاس نہیں ہیں نوکری دینے سے انکار کر دیا۔

ناکام ہو کر وطن میں اس ناکامی نے گاندھی جی کا امیدوں بھرا دل توڑ دیا۔ اور وہ بہت اُداس رہنے لگے۔ باوجود تعلیم پر سینکڑوں ہزاروں روپے خرچ کرنے کے انہیں اب تک کوئی روزگار نہ مل سکا اس خیال نے انہیں ہلکان کر دیا اور وہ اپنے بھائی اور دوسرے احباب کے مشورے سے بمبئی میں چھ مہینے قیام کرنے کے بعد راجکوٹ واپس آ گئے۔

کام چل نکلا راجکوٹ پہونچکر گاندھی جی نے پھر ہمت باندھی اور ایک دفتر قائم کر کے کام کی ابتدا کی اس مرتبہ انہیں کچھ کامیابی کی جھلک نظر آئی اور خاصا کام چلنے لگا۔ مقامی وکیلوں کی معرفت ان کے پاس عرضی دعوے مرتب کرنے کے لئے آنے لگے۔ اور اس طرح تقریباً تین سو روپے ماہوار کی آمدنی ہونے لگی۔ یہ اگرچہ فرنگیانہ اخراجات کے لئے کافی نہ تھی پھر بھی ایک حد تک کچھ اطمینان ملا اور گاندھی جی اس کامیابی سے بہت خوش ہوئے۔ عرصہ کی مایوسیوں کے بعد ایک راہ نظر آئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں گاندھی جی اس کامیابی کو کتنا اہم سمجھتے ہوں گے۔

سفارش کرنے گئے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب گاندھی جی اپنے وطن راجکوٹ میں اطمینان کی زندگی شروع کر چکے تھے۔ کہ پولیٹکل ایجنٹ کے پاس اپنے بھائی کی ایک سفارش کے لئے انہیں جانا پڑا۔ اُن کے بھائی پر پولیٹکل ایجنٹ کی عدالت سے کوئی الزام لگ رہا تھا۔ یہ حاکم انگریز تھا اور گاندھی جی کے قیام انگلستان میں اس سے گاندھی جی کی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

اس دوستی کی بناء پر گاندھی جی کو پورا یقین تھا کہ سفارش سے یقیناً فائدہ ہوگا اور وہ انگریز تعلقات کو محسوس کرکے گاندھی جی کی بات مان لے گا۔

بے تمیز انگریز

پہلی ہی نظر میں اس انگریز نے گاندھی جی کو پہچان لیا انگلستان کے بعد گاندھی جی کی اس انگریز سے یہ پہلی پرائیویٹ ملاقات تھی اور انہیں اس کی دوستی پر پورا بھروسہ تھا وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ پرائیویٹ ملاقات ہوگی تو وہ بہت تپاک سے ملے گا اور قیام انگلستان کی دلچسپ باتوں کا تذکرہ ہوگا مگر انہیں کیا خبر تھی کہ انگریز انگلستان میں کچھ اور ہوتا ہے اور اپنی نوکری پر ہندوستان آجانے کے بعد کچھ اور ہو جاتا ہے۔

یہ بھی انگریز تھا اور ہندوستانی نقطۂ نظر سے اخلاق کا بدترین دشمن۔ گاندھی جی کو یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ انگریز اپنی خوش مزاجی بھی بھول چکا ہے اور دوستی تو اُس کے خیال میں کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ اس نے بہت ہی انجان ہو کر بد تہذیبی اور تحقیر کے لہجہ میں گاندھی جی سے گفتگو کی۔ بات یہ تھی کہ ہندوستان میں وہ پولیٹکل ایجنٹ تھا اور ایک بڑی عدالت کا حاکم۔ اس کے خلاف گاندھی جی ہندوستانی تھے اور اس کی عدالت میں آنے والے ایک معمولی وکیل۔

گاندھی جی بیرسٹر نہیں بیرسٹر کے باپ کیوں نہ ہوں مگر سفید چمڑے والے انگریز اور وہ بھی با اختیار حاکم کے سامنے ان کی کیا پوزیشن تھی اس کا جواب

تعصب کے دیوتا سے پوچھئے۔ جس نے غریب کالے ہندوستانیوں کو مغرور انگریزوں کی نظر میں غلامی اور جہالت کی تصویر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

چپراسی کے ذریعہ نکلوا دیا

اس طوطہ چشم انگریز نے نہایت ہی بے رخی کے ساتھ گاندھی جی کی باتیں سنیں اور کہا کہ تمہارا بھائی چالاک آدمی ہے اُسے ضرور سزا ملے گی۔ یہ سن کر گاندھی جی نے پھر سفارش کی تو اس بے تمیز انگریز نے نہایت حقارت کے ساتھ گاندھی جی کو ڈانٹ دیا۔ اور جب اس کے بعد بھی گاندھی جی نے عاجزی کے لہجہ میں کچھ کہنا چاہا تو اس انگریز نے چپراسی کو حکم دیا کہ ان کو باہر نکال دو۔ چپراسی آگے بڑھا اور اس نے گاندھی جی کو دھکے دیکر باہر نکال دیا۔ گاندھی جی کے الفاظ میں بھی اس واقعہ کی کیفیت سن لیجئے۔

"انہوں نے چپراسی کو بلا کر حکم دیا کہ مجھے دروازہ کے باہر پہونچا دو میں اب تک پس و پیش کر رہا تھا کہ چپراسی نے آکر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے اور مجھے کمرہ سے باہر نکال دیا۔"

اب آنکھیں کھلیں

اس بدتمیز انگریز نے انگریزی تہذیب پر ایک بدنما داغ لگا کر ساری قوم کو بدنام کیا۔ اور ایسے ہی مغرور اور جابر انگریزوں نے انگریزوں جیسی با اخلاق اور ملنسار قوم کو ہندوستان میں بدنام کر دیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمام یورپ میں انگریز قوم کا حسن اخلاق مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اس ہتک آمیز واقعہ سے گاندھی جی کی آنکھیں کھلیں اور انہیں احساس ہوا کہ انگریز ہندوستانی کو کتنا کم حیثیت سمجھتا ہے۔ اس احساس نے آگے جا کر حصول آزادی کا جذبہ اختیار کیا جو آج تک گاندھی جی کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے اور جس کے لئے وہ تقریباً چالیس پچاس برس سے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

گاندھی جی کو اپنی وہ توہین آج تک یاد ہے اور ایک گاندھی ہی کیا کوئی خوددار

ہندوستانی ایسی افسوسناک توہین کو گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

آمدنی بند چونکہ گاندھی جی راجکوٹ میں وکالت کرتے تھے اور زیادہ تر مقدمے اسی انگریز کی عدالت میں جاتے تھے اس لئے آمدنی پر اس انگریز بہادر کی بد دماغی کا اثر پڑنا بھی لازمی تھا۔ اور پڑا۔ روز بروز آمدنی گھٹتی گئی۔ اور گاندھی جی نئے روزگار کی تلاش میں رہنے لگے۔

اس انگریز پر توہین کے جرم میں گاندھی جی مقدمہ بھی چلانا چاہتے تھے مگر بعض وکیلوں نے اس اقدام سے گاندھی جی کو باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہندوستان میں وکیلوں اور بیرسٹروں کو ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں۔ گاندھی جی اپنے مستقبل کے خیال سے خون کا سا گھونٹ پی کر چپ ہو گئے۔

افریقہ کا سفر

اسی زمانہ میں پوربندر کے ایک مشہور تاجر کا مقدمہ جنوبی افریقہ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ اور اس میں ایک ایسے ہندوستانی وکیل کی ضرورت تھی جو یہاں کے تمام معاملات افریقہ کے بیرسٹروں کو سمجھا کر قانونی مشورے دے سکے۔ اور وہاں پہونچکر عدالتی حالات گجراتی زبان میں پوربندر بھیج سکے۔

گاندھی جی کے بھائی نے اس تاجر سے معاملہ کر کے گاندھی جی کو افریقہ بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ اگرچہ اس سفر میں مالی منفعت کی زیادہ امید نہیں تھی لیکن غیر ملک کا سفر اور مشہور وکلاء سے ملاقات کا تجربہ یقینی تھا۔ گاندھی جی خوشی خوشی افریقہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ کام ایک سال کا تھا۔ تاجر نے آمد و رفت کا کرایہ اور تمام اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے معاوضہ دینے کا وعدہ کیا۔

جہاز میں گاندھی جی تمام ضروری سامان لے کر بمبئی پہونچے اور وہاں تاجر کے ایجنٹ سے ملے۔ ایجنٹ نے کہا کہ جو جہاز آج جانے والا ہے۔ میں نے اس میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لینے کی بہت کوشش کی مگر چونکہ اس جہاز سے ایک گورنر جا رہے ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے مسافر ہیں اس لئے نہ فرسٹ کلاس میں جگہ ہے نہ سیکنڈ میں۔ اگر آپ چاہیں تو ڈیک پر جا سکتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی اپنی بیرسٹری کی شان دکھانے کیلئے فرسٹ کلاس سے کم میں سفر ہی نہ کر سکتے تھے۔ یہ حالات سنکر وہ کسی قدر پریشان ہوئے اور انہوں نے سوچا کہ جہاز کے کپتان سے مل کر کوشش کرنی چاہیئے۔ شاید وہ کوئی جگہ دلا سکے۔

جہاز کا کپتان ایک انگریز تھا۔ وہ گاندھی جی کے حالات سنکر بہت خوش ہوا اور ان کا دوست بن گیا۔ آدمی نیک تھا۔ بے چارے نے بہت کوشش کی مگر جہاز کی تمام سیٹیں پہلے ہی مخصوص ہو چکی تھیں۔ اس لئے وہ کچھ نہ کر سکا۔ تب اس نے کہا۔ اگر آپ پسند کریں تو میں اپنے کیبن کی زائد جگہ آپ کو دیدوں گا۔ گاندھی جی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور فوراً ہی اپنے ایجنٹ کو بھیجکر ٹکٹ منگوا لیا۔ اور ان تمام مراحل کے بعد اپریل ۱۸۹۳ء میں گاندھی جی جنوبی افریقہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

پہلا اسٹیشن جہاز بمبئی سے روانہ ہو کر مسلسل تیرہ دن چلتا رہا۔ اور اس عرصہ میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جس کا ذکر کیا جائے۔ البتہ ان ایام میں کپتان سے گاندھی کی بہت گہری دوستی ہو گئی۔ اُس نے گاندھی جی کو شطرنج کھیلنا سکھایا اور یہ وقت اکثر شطرنج میں ہی گزرا۔ اسی زمانہ میں ایک انگریز بھی کپتان کا دوست ہو گیا۔ یہ انگریز چال چلن کا اچھا نہیں تھا اور اس نے آگے جاکر گاندھی جی کو پھر ایک اخلاقی گناہ میں پھانسنا چاہا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ جہاز کا پہلا اسٹیشن لامو تھا۔ جہاں تین چار گھنٹہ جہاز کو ٹھہرنا تھا۔

مسافر رہ گئے جب جہاز لامو بندرگاہ پر پہونچا تو اکثر مسافر بندرگاہ دیکھنے کے لئے جہاز سے اتر پڑے۔ کپتان نے سخت تاکید کردی تھی کہ جہاز یہاں زیادہ نہیں ٹھہرے گا اس لئے مسافر زیادہ دیر نہ لگائیں۔ مگر اس کے باوجود مسافروں نے بندرگاہ پر بہت دیر کردی اور بہت سے مسافر جہاز کی روانگی تک واپس نہ پہونچ سکے کپتان نے جہاز کو پانچ منٹ اور لیٹ کیا لیکن پھر بھی بہت سے مسافر رہ گئے۔

دوسرا اسٹیشن لامو کے بعد دوسرے اسٹیشن ممباسہ پر جہاز ٹھہرا۔ یہ بندرگاہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ اگرچہ یہاں بھی مسافروں نے بندرگاہ کی سیر کی لیکن سب مسافر ڈرے ہوئے تھے اس لئے جلدی ہی واپس آگئے اور کوئی ناگوار حادثہ پیش نہیں آیا۔

تیسرا اسٹیشن جہاز کا تیسرا اسٹیشن زنجبار آیا۔ یہاں آٹھ دس روز ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اس واسطے اکثر مسافر بندرگاہ پر اپنے رہنے کے لئے مکان لے لیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں سے جہاز تبدیل کیا جاتا ہے۔

زنجبار میں سیر کا بہت موقع تھا۔ کپتان نے گاندھی جی اور اپنے انگریز دوست کو سیر کی دعوت دی۔ اور یہ تینوں دوست سیر کرنے کے لئے نکل گئے۔ کچھ دور آگے جاکر کپتان نے ایک آدمی سے کچھ باتیں کیں اور وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ یہ اجنبی ایک دلال تھا۔ چنانچہ یہ ان تینوں کو حبشی عورتوں کے محلہ میں لے گیا اور ایک مکان میں لے جاکر تین کمرے بتادئے۔

گاندھی جی اگرچہ سمجھ گئے تھے کہ وہ کہاں جارہے ہیں مگر انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور بلا چون و چرا اپنے کمرہ میں چلے گئے۔

غیر عورت کے کمرہ میں اس کمرہ میں ایک حبشی نوجوان عورت آنے والے کا انتظار کررہی تھی گاندھی جی نے جوں ہی اس کمرہ میں قدم

رکھا انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا ہوتا تھا۔ بہر حال ان کے ضمیر نے انہیں ایک طریقہ بتادیا اور وہ اس کمرہ میں اس وقت تک خاموش کھڑے رہے جب تک کپتان نے باہر سے آواز نہ دی۔

اگرچہ اس نازک موقع پر ایک نوجوان مرد اور عورت ایک جگہ تھے۔ مگر گاندہی جی کے قدموں کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی اور خدا کے فضل سے وہ پاک دامن ہی واپس آئے۔ اس افسوسناک واقعہ کا ذکر گاندہی جی نے کیا۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"ایک دلال ہم لوگوں کو حبشی عورتوں کے یہاں لے گیا اور اس نے ہم تینوں کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں پہونچادیا۔ میں دم بخود کھڑا تھا اور شرم سے گڑا جاتا تھا۔ خدا جانے وہ بے چاری عورت مجھے کیا سمجھتی ہوگی مگر جب کپتان نے مجھے پکارا تو جیسا گیا تھا ویسا ہی آگیا۔"

گاندہی جی کی زندگی کا یہ تیسرا واقعہ تھا جہاں سے وہ پاکدامنی کے ساتھ بچ گئے۔ پہلا واقعہ بچپن کے بُرے دوست کے ساتھ پیش آیا تھا اور دوسرا پیرس میں تاش کھیلنے وقت اور تیسری مرتبہ زنجبار میں۔ اور خدا کے فضل سے تینوں بار گاندہی جی کا دامن پاک رہا

افریقہ میں

زنجبار سے آٹھ روز کے بعد پھر روانہ ہوئے اور وہاں سے زنبیق ہوتے ہوئے ناٹال کی بندرگاہ ڈربن پہونچے۔

بندرگاہ پر افریقی فرم کے مالک عبد اللہ سیٹھ ان کے منتظر تھے۔ معمولی سی تلاش کے بعد وہ گاندہی جی کو مل گئے اور وہ انہیں اپنے ساتھ دوکان پر لے گئے۔ مگر وہ گاندہی جی کو دیکھکر اور ان کے حالات سنکر زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ شاید انہیں اخراجات کی فضول زیادتی کا خیال آگیا۔

گاندھی جی نے تعارف کا خط دیا۔ اور ہندوستان کے حالات بتلائے۔ عبداللہ سیٹھ نے کہا کہ ابھی مقدمہ شروع ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اس کے علاوہ مقدمہ ٹرانسوال کی عدالت میں ہے۔ اور ہمیں ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو وہاں کے وکیلوں کو ہماری بات انگریزی میں سمجھا سکے۔ گاندھی جی نے انہیں اطمینان دلا دیا اور کہا کہ یہ سب کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔

پگڑی اتار دو

عبداللہ سیٹھ گاندھی جی کو اپنے ساتھ ڈربن کی عدالت میں بھی لے گئے تاکہ وہاں کی عدالتوں کا کچھ تجربہ ہو جائے۔ اور عدالت میں اپنے وکیل کے ساتھ گاندھی جی کو وہاں کی کارروائی دیکھنے کے لئے بٹھا دیا۔

مجسٹریٹ نے بہت غور کے ساتھ گاندھی جی کو اور ان کے دلچسپ لباس کو دیکھا۔ گاندھی جی اس وقت ہندوستانی لباس پہ گجراتی وضع کی پگڑی باندھے ہوئے تھے اول تو مجسٹریٹ بہت حیرت کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس نے گاندھی جی کو حکم دیا کہ سر سے یہ پگڑی اتار دو۔

اس انوکھے اور تعصبانہ حکم سے گاندھی جی کو بہت حیرت ہوئی۔ اور اس عجیب حکم کی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے علاوہ مجسٹریٹ کا رویہ کسی قدر تحقیر آمیز تھا۔ گاندھی جی نے اس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور عدالت کے کمرے سے نکل گئے۔

اس توہین کا ذکر گاندھی جی نے سیٹھ عبداللہ سے کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہاں ہر ہندوستانی کو یہی حکم ہے کہ وہ عدالت میں داخل ہوتے وقت سر سے پگڑی وغیرہ اتارے۔ اسی سلسلہ گفتگو میں گاندھی جی کو افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی روح فرسا مشکلات اور گورنمنٹ افریقہ کی سختیوں کا علم ہوا۔

کالا آدمی

افریقہ میں ہندوستانیوں کی بے بسی اور گاندھی جی کے ساتھ افریقہ والوں کا بُرا برتاؤ سمجھنے کیلئے اور اس کی صحیح وجہ معلوم کرنے کے ضروری معلوم

ہوتا ہے کہ اس موقع پر ناظرین کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ افریقہ میں ہندوستانی باشندے اس کثرت سے کیوں ہیں اور یہ لوگ کب اور کن حالات میں افریقہ گئے تھے۔ اور کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر افریقہ میں کالا آدمی انتہائی ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ اب سے تقریباً ستر اسی سال پہلے جب افریقہ کے مشہور صوبہ ناٹال کو آباد کرنے اور شاندار بنانے کی اسکیم وہاں کی گورنمنٹ نے تیار کی تو اُسے کچھ ایسے سستے اور بے عذر مزدوروں کی ضرورت پیش آئی جو وہاں زراعت اور دوسرے ذرائع آمدنی میں اضافہ کا باعث ہوں اور خون پسینہ ایک کر کے ناٹال کو زرخیز ملک بنا دیں۔

بدقسمتی سے گورنمنٹ افریقہ کی نظر انتخاب غریب اور فاقہ کش ہندوستانیوں پر پڑی اور اس نے انگلستان کی حکومت کے ذریعہ ہندوستانی گورنمنٹ سے معاملہ کر کے ہندوستانی مزدوروں کو اپنے ہاں لانے کی اجازت لے لی۔ چنانچہ باہمی گفتگو کے بعد ایک مقررہ میعاد کے لئے ہندوستانی مزدوروں کو افریقہ لے جانے کا قانون پاس ہو گیا۔ اس زمانہ میں ناٹال گورنمنٹ نے ہندوستانی حکومت کو یقین دلا دیا تھا کہ ان غریب مزدوروں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ رہے گا اور انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو سکے گی۔ بلکہ اگر یہ مزدور زمانہ میعاد کے بعد بھی افریقہ میں رہنا چاہیں گے تو انہیں ہر قسم کی امکانی سہولت بھی بہم پہونچائی جائیں گی۔ یہ عہدنامہ ۵ پانچ سال کے لئے ہوتا تھا۔

سفید گورنمنٹ

یہ وعدے اگرچہ سفید گورنمنٹ کے سفید گورنمنٹ سے ہوئے ہوئے تھے لیکن پھر بھی بہت دن تک ان پر عملدر آمد ہوتا رہا اور افریقہ میں رہنے والے ہندوستانی مزدوروں کو کوئی شکایت نہیں ہوئی لیکن بعد میں گورنمنٹ ناٹال کا حافظہ کمزور ہو گیا اور اُسے اپنے کئے ہوئے وعدے یاد نہیں رہے۔

بہر حال معصوم اور مفلس ہندوستانی بھرتی کرنے والے ایجنٹوں کی معرفت افریقہ پہونچنے لگے۔ انہیں ہندوستان میں بتادیا گیا تھا کہ افریقہ ہندوستان سے کہیں زیادہ خوبصورت ملک ہے وہاں رہ کر آدمی جنت کا سا مزا لوٹتا ہے۔ وہاں کی حکومت بہت نیک اور رعایا کی سچی ہمدرد ہے۔

بھولے بھالے ہندوستانی ان سفید اطلاعوں پر ریجھ گئے۔ اور ہزاروں کی تعداد میں افریقہ پہونچ گئے۔ مگر وہاں پہونچنے کے بعد انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا انہوں نے دیکھا کہ جس کو افریقہ میں انتہائی مروت اور ہمدردی کہا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان میں انتہائی سنگدلی اور ظلم وستم کے نام سے موسوم ہے۔ وہاں کے رہنے والے اور خصوصاً مزدوروں کے آقا تو اتنے نیک اور رحم دل ہیں کہ اگر ان کی صحبت میں فرشتوں کو رکھا جائے تو وہ بھی بھیڑیئے بن جائیں۔

دوزخ کی زندگی ہندوستانی مزدور اپنے ہاتھ کٹا چکے تھے اور مقررہ وقت تک کا معاہدہ کر چکے تھے اس لئے وہاں سے قبل از وقت لوٹ آنا محال تھا۔ ناچار اس دوزخ کی زندگی کے لئے مجبور ہوگئے۔ انہیں اس میعاد کے زمانہ میں یہ حق کسی طرح نہ تھا کہ اگر ان کے سفید آقا کوئی ظلم یا جبر کریں تو اُن کے خلاف آواز نکال سکیں یا کسی صورت اپنا معاہدہ منسوخ کرسکیں۔

ان میعادی مزدوروں کے لئے جو قانون افریقی گورنمنٹ نے مرتب کئے وہ بھی انصاف سے کچھ زیادہ متصل نہیں تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ ان تکلیف دہ قوانین پر سختی کے ساتھ عملدرآمد کیا جاتا تھا۔

دشمنی کا ٹیکس چونکہ ناٹال کو مزدوروں کی ضرورت تھی اس لئے جب کسی ہندوستانی مزدور کا معاہدہ ختم ہوجاتا تھا اور وہ اس دوزخ کی زندگی سے گھبرا کر ہندوستان آنا چاہتا تھا تو اس سے بے انتہا بغض اور حسد سے

کام لیا جاتا تھا۔ اور کوشش کی جاتی تھی کہ وہ دوبارہ اپنا نام مزدوروں کی فہرست میں لکھا کر پھر ایک میعاد کے لئے معاہدہ کرلے۔ اور جب اس سے کام نہ چلتا تھا تو اس کی واپسی میں طرح طرح کی قانونی پیچیدگیاں حائل ہو جاتی تھیں اور وہ بے چارہ وہیں زندہ درگور رہنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

مزدوروں کے علاوہ ہندوستان کے بعض تاجر اور ڈاکٹر وغیرہ لوگ بھی افریقہ چلے گئے تھے۔ انہیں بھی ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے موجود افریقہ کا سبز باغ نظر آگیا۔ بہت سے وکیل اور مذہبی پیشوا بھی وہاں پہونچ گئے۔ چونکہ افریقہ میں ہندوستانیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اس واسطے اِن سب کے کاروبار چل نکلے۔ مگر ان ہندوستانیوں کے ساتھ بھی وہاں والوں کا تعصب قائم رہا۔ بلکہ سختیوں میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا تمام ہندستانی ایک ہی لاٹھی سے ہانکے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو اس جبر و ستم کی عادت پڑ گئی اور ہر قسم کی مصائب برداشت کرنے کے باوجود وہاں مستقل طور پر رہنے لگے افریقی گورنمنٹ نے جب یہ دیکھا کہ بہت سے ایسے ہندوستانی بھی افریقہ پہونچ گئے ہیں جن سے اُس کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا بلکہ وہ خود کاروباری فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ایک نئے ٹیکس کی ابتدا کر دی جس کی رو سے ہر ہندوستانی کو ایک معقول[۱] رقم بطور ٹیکس ادا کرنا پڑتی تھی۔ غریب مزدور اس ٹیکس سے بہت پریشان تھے کیونکہ یہ رقم فی کس ادا کرنا پڑتی تھی گھر کی عورتوں اور بچوں تک پر یہ ٹیکس تھا۔

غرضیکہ جنوبی افریقہ والے اِن ہندوستانیوں کو جو زبردستی بلائے گئے تھے یا خود ہی پہونچ گئے تھے ایک ناپاک اور ناقابل توجہ ہستی خیال کرتے تھے۔ اور ان کا خیال تھا۔ کہ ہندوستانی قوم صرف خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے اس سے جتنی بھی خدمت لی جائے

---

[۱] بعد کو گاندھی جی کی مسلسل کوششوں اور دوڑ دھوپ کے بعد اس ٹیکس کی رقم میں بہت کمی کر دی گئی اور صرف پینتالیس روپے (یعنی ۳ پونڈ) فی کس رہ گیا تھا۔

وہ سفید رنگ والوں کا حق ہے۔ اسی لئے جی بھر کے مزدوروں سے کام لیا جاتا تھا۔

ذلت کی زندگی

بچارے غریب مزدور سدان درندوں سے بہت ہی خوف زدہ تھے۔ اور ان کا کوئی حکم نہ ٹال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام ملک میں جہاں جہاں بھی ہندوستانی تھے ان کے ساتھ انتہائی ذلت کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ مگر ان ہندوستانیوں کی یہ مجال نہ تھی کہ اس تحقیر کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کر سکیں۔ اگر وہ ایسا کرتے بھی تھے تو انجام کار پچھتاتے تھے۔

اس عام دشمنی کی ایک وجہ تو کالے گورے رنگ کا فرق تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی تاجر سفید تاجروں کے تجارتی میدان میں فائدہ اٹھا رہے تھے اور تیسری وجہ ایک اور تھی وہ یہ کہ وہاں کے باشندے کالے اور غیر مہذب ہندوستانیوں کے ساتھ رہنے سہنے کو اپنی تہذیب اور شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ جو ہندوستانی تاجر یا ڈاکٹر وغیرہ ہندوستان سے افریقہ پہونچ چکے تھے ان پر ٹیکس کی آفت لائی گئی اور نئے آنے والوں پر بہت سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

پریٹوریا کی ریل

گاندھی جی تقریباً آٹھ روز ڈربن میں رہے اس عرصہ میں انہوں نے افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی ان مشکلات اور مصائب کا حال معلوم کر لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی میل پھر کر انہوں نے کچھ لوگوں سے دوستی بھی کر لی۔

مقدمہ چونکہ پریٹوریا میں تھا۔ اس لئے عبد اللہ سیٹھ اور ان کے آدمیوں سے مقدمہ کے تمام حالات سمجھ کر وہ پریٹوریا کے لئے روانہ ہو گئے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خرید کر سیٹھ عبد اللہ نے انہیں ٹرین میں سوار کرا دیا۔ اور قیام وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات سمجھا دیں۔ گاندھی جی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ٹرین روانہ ہو گئی۔

تقریباً نو بجے رات کو گاڑی میرٹیز برگ (نا ٹال کے دار الحکومت) پر پہونچی

گاندھی جی اس وقت گاڑی میں لیٹے ہوئے تھے۔ کہ ایک سفید چمڑے کا مسافر آیا اس کے ساتھ بھی کچھ سامان تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا کہ ایک کالا آدمی نہایت لاپروائی کے ساتھ فرسٹ کلاس میں لیٹا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ مسافر چلا گیا۔

ریلوے ملازم کی بدتمیزی

تھوڑی دیر کے بعد وہ مسافر پھر آیا اب اس کے ساتھ چند ریلوے ملازمین بھی تھے ان میں سے ایک نے جو بظاہر ان کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ گاندھی جی سے کہا کہ تم اس درجہ سے نکل جاؤ۔ گارڈ کے ڈبے میں جا کر بیٹھو۔"

یہ سنکر گاندھی جی نے اپنا فرسٹ کلاس ٹکٹ دکھاتے ہوئے کہا کہ میرے پاس اسی کلاس کا ٹکٹ ہے مگر وہ نہ مانا اور برابر گاڑی سے اتر جانے پر اڑا رہا۔ ادھر گاندھی جی کو بھی ضد آگئی اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میرے پاس فرسٹ کلاس ٹکٹ ہے اور میں اسی درجہ میں سفر کرنے کا حق رکھتا ہوں۔

فرسٹ کلاس سے نکل جاؤ

ریلوے ملازم کو گاندھی جی کی یہ بات بہت ناگوار ہوئی اُس نے کہا۔ مانا تمہارے پاس فرسٹ کلاس ٹکٹ ہے۔ اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ تمہیں اس کلاس میں سفر کرنے کا حق ہے مگر میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہ ڈبہ خالی کر دو ورنہ میں پولیس کے ذریعہ تمہیں گاڑی سے نکال دوں گا۔

گاندھی جی بولے تمہیں اختیار ہے جو چاہو کر سکتے ہو لیکن میں حق پر ہوں۔ اور کوئی غلطی نہیں کر رہا ہوں اس واسطے میں اپنی مرضی سے نہیں اتروں گا۔

پولیس کو بلا لیا

گاندھی جی کا جواب سنکر وہ بدتمیز افسر آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے پولیس کے ایک کانسٹبل کو آواز دی۔ کانسٹبل آیا اور اس نے گاندھی جی کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی ریل کے باہر کھینچ لیا۔ اور ان کا تمام سامان بھی نکال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا گیا۔

دوسری جگہ بیٹھو گاندھی جی کو باہر کھینچ کر سپاہی نے رعونت سے کہا کہ تم کسی دوسری جگہ جا بیٹھو یہ درجہ "ان صاحب" کے لئے خالی کرایا گیا ہے۔ مگر گاندھی جی نے کسی دوسری جگہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔

گاڑی چھوٹ گئی اس انکار کا ریل والوں پر کوئی اثر نہیں ہوا اور گاڑی روانہ کر دی گئی۔ گاندھی جی بے سروسامان پلیٹ فارم سے اٹھے اور اپنا ایک قیمتی ہینڈ بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے مسافر خانہ میں جا بیٹھے۔ باقی تمام سامان وہیں پلیٹ فارم پر پڑا چھوڑ دیا جسے بعد میں ریلوے کے آدمیوں نے اٹھا لیا۔

مرٹیز برگ چونکہ پہاڑی اور اونچی جگہ ہے اس لئے وہاں سردی بہت سخت پڑتی ہے۔ گاندھی جی اس دن تمام رات سردی سے کانپتے رہے۔ اوورکوٹ بھی سامان کے ساتھ ریلوے کے ملازموں کے پاس تھا مگر ندامت کے خیال سے گاندھی جی کو ہمت نہ ہوئی کہ جا کر اوورکوٹ لے آئیں اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی تھا کہ جب یہ لوگ اتنے جانور اور بدتمیز ہیں تو بہت ممکن ہے دوبارہ بھی ذلیل کریں۔

تمام رات سردی نے بے تاب رکھا۔ اور وہ سوچتے رہے کہ اب کیا کیا جائے اگر اس توہین کی قانونی چارہ جوئی کی جائے تو اصل مقصد فوت ہوا جاتا ہے۔ یعنی مقدمہ کی حاضری مشکل ہے اس کے علاوہ ایسی قانونی چارہ جوئی کا انجام وہ پہلے ہی سن چکے تھے۔ اس لئے فی الحال یہی بہتر سمجھا کہ جو کچھ ہو چکا اسے یہی سمجھنا چاہئے کہ کچھ نہیں ہوا۔

خوفناک مسافر خانہ گاندھی جی نے تمام رات جاگ کر کاٹی۔ سردی اس بلا کی تھی کہ خدا کی پناہ۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مسافر خانہ بالکل خالی اور تاریک۔ جہاں خواہ مخواہ اجنبی آدمی کو دہشت معلوم ہو۔ بہرحال جیسے تیسے گاندھی جی نے صبح کر دی۔

علی الصباح اس اسٹیشن سے ایک تار محکمۂ ریل کے جنرل منیجر کے نام دیا اور تمام واقعہ کی اطلاع عبداللہ سیٹھ کو بھی بھیجدی۔ عبداللہ سیٹھ ڈربن میں ریلوے کے جنرل منیجر سے ملے مگر انہیں کیا جواب ملا؟ وہی جس کی امید تھی۔ انہیں بتایا گیا کہ ریلوے ملازم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اگر گاندھی جی کو فرسٹ کلاس سے نکال دیا تو اس میں حرج ہی کیا ہو گیا وہ کسی دوسری جگہ بیٹھ سکتے تھے۔ بہرحال جنرل منیجر صاحب نے اتنا ایثار ضرور فرمایا کہ مرٹیزبرگ کے اسٹیشن ماسٹر کو فوراً اطلاع بھیجدی کہ اس اجنبی مسافر کو احتیاط کے ساتھ منزل مقصود تک پہونچادیا جائے۔

عبداللہ سیٹھ نے مرٹیزبرگ کے دوستوں کو بھی گاندھی جی سے ملنے کی ہدایت بذریعہ تار بھیجدی تھی چنانچہ اگلے دن صبح سے شام تک وہ لوگ ملاقات کے لئے آتے رہے اور سارا دن وہ واقعات سننے میں گزر گیا جو آئے دن وہاں کے ہندوستانیوں کے ساتھ ریلوے سفر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ شام کو پریٹوریا کی گاڑی پھر آئی اور گاندھی جی اس میں سوار ہو کر مرٹیزبرگ سے روانہ ہو گئے۔

گورے نے ڈانٹ دیا

اگلے دن صبح یہ گاڑی چارلس ٹاؤن پہونچی۔ اس سے آگے ریل نہ تھی اور گاندھی جی کو پریٹوریا جانا تھا۔ چارلس ٹاؤن اور جوہانسبرگ کے درمیان اس زمانہ میں شکرم چلا کرتی تھی اور جوہانسبرگ سے آگے پھر ریل مل جاتی تھی۔ اس لئے چارلس ٹاؤن پہونچکر گاندھی جی نے ریل سے سامان اتار دیا۔

شکرم کے ایجنٹ کو بھی عبداللہ سیٹھ نے ڈربن سے تار دیدیا تھا۔ مگر جب گاندھی جی شکرم کے ایجنٹ سے ملے تو وہ طرح طرح کے بہانے کرنے لگا۔ دراصل بات یہ تھی کہ شکرم کے تمام مسافر فرنگی تھے اور وہ کالے آدمی کو ان عزت داروں کے ساتھ بٹھانا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

یہ شکرم روزانہ چارلس ٹاؤن سے جوہانسبرگ تک جایا کرتی تھی اور راستہ میں

اسٹینڈرٹن کے مقام پر تمام رات ٹھہری رہتی تھی۔ اس کا منتظم جسے "لیڈر" کہا جاتا تھا ایک گورا تھا۔ وہ بھی کالے مسافر کو دیکھ کر جل گیا۔

شکرم کا طریقہ یہ تھا کہ اس کے اندر ایک لمبا چوڑا کوچ ہوتا تھا جس پر مسافر بٹھائے جاتے تھے۔ اور اس کوچ کے دونوں طرف ایک ایک آدمی کی جگہ تھی۔ جس پر شکرم کا ایک ملازم اور دوسری پر لیڈر بیٹھتا تھا۔ اور ایک طرف کوچوان کی جگہ تھی۔

گاندھی جی کے پاس اگرچہ شکرم میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا مگر اس گورے لیڈر نے کہا کہ تم میری جگہ بیٹھ سکتے ہو اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اندر مسافروں کے پاس کوچ پر جا بیٹھا۔

یہ اگرچہ بہت ذلت کی بات تھی مگر گاندھی جی اس سے پہلے بھی کالے گورے کا فرق اور اس کا انجام دیکھ چکے تھے۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک فرسٹ کلاس مسافر کی جگہ خالی ہے۔ جس پر لیڈر نے خود قبضہ کر لیا ہے اور اپنی ذلیل جگہ اُن کے لئے چھوڑ دی ہے۔ مگر انہوں نے صبر اور ضبط سے کام لیا۔ بادل ناخواستہ اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ شکرم روانہ ہو گئی۔

موںہہ پر گھونسے مارے

اس ذلت اور توہین کے بعد بھی گورے کو صبر نہیں آیا۔ وہ پھر کچھ دیر بعد وہ پھر گاندھی جی کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ اے قلی[1] تم اس جگہ سے ہٹ جاؤ۔ یہاں ہم بیٹھیں گے اور تمباکو پئیں گے۔

یہ سن کر گاندھی جی نے کہا تم نے پہلے ہی میرے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ حالانکہ میرے پاس فرسٹ کلاس ٹکٹ ہے۔ اور میں مسافروں کے ساتھ اندر بیٹھنے کا حق رکھتا ہوں مگر تم نے مجھے وہاں جگہ نہ دی اور یہاں بٹھا دیا۔ اور اب کہتے ہو کہ یہاں سے بھی اٹھ جاؤ۔ بتاؤ میں کہاں بیٹھوں۔

---

[1] اس زمانہ میں افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کو وہاں کے لوگ قلی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ ہندوستانیوں کا بیشتر حصہ افریقہ میں مزدوری کے لئے گیا تھا۔

یہ سن کر گورے نے کوچبان کے پیروں میں ایک میلا سا ٹاٹ فرش پر بچھا کر اشارہ کیا۔ "یہاں۔"

گاندھی جی نے حیرت سے پوچھا۔ جوتے رکھنے کی جگہ؟

"ہاں۔"

"مگر میں تو یہاں نہیں بیٹھنا چاہتا۔" گاندھی جی نے یہ فقرہ ابھی پورا بھی نہ کیا تھا کہ بدتمیز گورے نے اٹھ کر گاندھی جی کے موہنہ پر گھونسے مارنا شروع کر دیا۔ گاندھی جی اس سے بہت کمزور تھے۔ مجبوراً مار کھاتے رہے۔ مگر اس بدمعاش کو مارنے کے بعد بھی صبر نہ آیا اور اس نے چلتی شکرم سے گاندھی جی کو نیچے پھینک دینا چاہا۔ ان کے دونوں بازو پکڑ کر دھکیلنے لگا۔ مگر دور گاندھی کے ہاتھ میں ایک کٹہرا آگیا اور انہوں نے مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑ لیا۔ اور گورے کی انتہائی کوشش کے باوجود گاندھی جی کے ہاتھ سے کٹہرا نہ چھٹ سکا۔

چلتی شکرم میں سے نیچے گر جانا یقیناً موت کا باعث ہوتا۔ گاندھی جی نے بچاؤ کے لئے اپنی قوت صرف کر دی۔ اب مسافروں کو بھی گاندھی جی پر رحم آیا اور ان سب نے مل کر گاندھی جی کو گورے سے چھڑا لیا۔ مگر غلطی یہ کی کہ اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ اس پر گورا جل گیا اور اس نے کہا۔ اب بچ گئے تو کیا ہوا۔ ذرا اسٹینڈرٹن آنے دو۔ بتا دوں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔

گاندھی جی کو اس دھمکی کا بڑا خیال ہوا۔ مگر اب نہ واپسی کی گنجائش تھی نہ کوئی امداد ہی میسر آ سکتی تھی۔ بہر حال جیسے تیسے شکرم اسٹینڈرٹن پہونچی۔ خدا کا شکر ہے کہ عبداللہ سیٹھ نے یہاں کے دوستوں کو بھی اطلاع دیدیا تھا اور وہ لوگ گاندھی جی کو لینے شکرم کے اڈے تک آئے تھے۔

چونکہ شکرم یہاں تمام رات ٹھہری تھی اس لئے گاندھی جی ان دوستوں کے ہمراہ ان کے مکان پر چلے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی رام کہانی سنائی۔ مگر یہاں بھی۔

گاندھی جی کو وہی میرٹز برگ کی طرح ہندوستانیوں کی بے بسی کے قصے سنانا پڑے ان لوگوں نے کہا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہاں ہندوستانیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ تاہم گاندھی جی نے شکرم کمپنی کے افسر کو یہ شکایت لکھ بھیجی۔ جو انجام کار بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ البتہ اس نے یہ جواب دیا کہ یہاں سے جو شکرم روانہ ہوگی اس میں جگہ زیادہ ہوتی ہے۔ تمہیں عام مسافروں کے ساتھ بٹھا دیا جائیگا۔

قیام گاہ سے علی الصبح گاندھی جی پھر شکرم کے اڈے پر آ گئے۔ اور انہیں جگہ مل گئی شام تک کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور یہ اسی رات جوہانسبرگ پہونچ گئے۔ عبداللہ سیٹھ نے تمام راستہ کا اپنی طرف سے معقول انتظام کر دیا تھا۔ چنانچہ جوہانسبرگ کے دوست بھی گاندھی جی کے منتظر تھے۔ مگر جو شخص ان کے استقبال کے لئے شکرم کے اڈے پر آیا تھا اس نے گاندھی جی کو نہیں پہچانا۔ اور یہ بے چارے ایک سواری میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف چل دیئے۔

ہوٹل سے نکال دیا

سب سے پہلے یہ جوہانسبرگ کی مشہور قیام گاہ گرانڈ نیشنل ہوٹل پہونچے اور اس کے منتظم سے مل کر اپنے لئے کمرہ طلب کیا۔ منتظم نے انہیں بہت غور سے دیکھ کر کہا۔ تمہارے لئے اس ہوٹل میں جگہ نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔

گاندھی جی کو یہ جواب سنکر بہت تعجب ہوا۔ مگر اس کی وجہ دریافت کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی۔ تب انہوں نے عبداللہ سیٹھ کے بتائے ہوئے پتے کی تلاش شروع کی سیٹھ نے انہیں محمد قاسم قمرالدین کی دوکان کا پتہ بتایا تھا۔ چنانچہ گاندھی جی ان کی دکان پر پہونچ گئے جہاں سیٹھ عبدالغنی ان کا انتظار کر رہے تھے اور انہوں نے بتایا کہ آپ کے استقبال کے لئے تو میں نے شکرم کے اڈے پر اپنے آدمی بھیجے تھے۔ گاندھی جی نے جواب دیا۔ وہ مجھے نہیں ملے۔

گاندھی جی نے یہاں پہونچکر ہوٹل کا واقعہ بیان کیا۔ عبدالغنی نے کہا۔ آپ ناحق

ہوٹل والے سے پوچھا۔ یہاں کے ہندوستانیوں کا ایسا مقدر کہاں ہے جو یہاں کے گوروں سے ایسے سلوک کی امید رکھیں۔ اور اس کے بعد سیٹھ غنی نے بھی ہندوستانیوں کی مشکلات کے بہت سے قصے سناتے ہوئے کہا کہ اب آپ پریٹوریا جا رہے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں سے بھی آپ کو پریٹوریا کا ٹکٹ تھرڈ کلاس کا ملے گا۔ کیونکہ فرسٹ اور سیکنڈ کلاس میں ہندوستانی سفر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ ابھی آپ نے ناٹال کی حالت دیکھی ہے۔ اب آپ کو ٹرانسوال کی کیفیت دیکھ کر اندازہ ہوگا کہ اس صوبہ میں ناٹال سے بھی زیادہ مصیبتیں ہندوستانیوں کے گلے پڑی ہوئی ہیں۔

ہندوستانیوں کی ان بے بسی کے واقعات نے گاندھی جی کو سفید چمڑے والوں کی طرف سے بری طرح بدظن کر دیا۔ اور مخالفت کا جو جذبہ ان کے دل میں قائم ہو چکا تھا اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

فرسٹ کلاس ٹکٹ مل گیا

ٹرانسوال میں عام طور پر ہندوستانیوں کو فرسٹ یا سیکنڈ میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی اور نہ انکو اونچے درجوں کا ٹکٹ ہی ملتا تھا۔ مگر گاندھی جی نے جوہانسبرگ کے اسٹیشن ماسٹر سے مل کر فرسٹ کلاس ٹکٹ کی درخواست کی۔

انہوں نے کہا کہ میں ہندوستانی بیرسٹر ہوں اور ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہوں۔ اور چونکہ مجھے آج ہی پریٹوریا پہونچنا ضروری ہے اس لئے مہربانی کر کے مجھے ریل کے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دیجئے۔

اسٹیشن ماسٹر بہت شریف آدمی تھا۔ اس نے گاندھی جی کی شرافت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔ اگرچہ یہاں ہندوستانیوں کو یہ ٹکٹ نہیں دئے جا سکتے۔ مگر میں ان گوروں کی طرح متعصب نہیں ہوں۔ ہالینڈ کا رہنے والا ہوں مجھے آپ کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ اگر افسروں کو یہ بات معلوم ہو گئی تو مجھ سے

بری طرح پیش آئیں گے۔ اگر آپ اس معاملے میں مجھے نہ گھسیٹیں تو میں آپ کو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ دلادوں گا۔

گاندھی جی اسٹیشن ماسٹر کی مشکلات کو سمجھ گئے اور انہوں نے وعدہ کرلیا کہ اگر راستہ میں روک ٹوک ہوئی تو وہ اسٹیشن ماسٹر کو مشکلات میں نہ پھنسنے دیں گے۔ اس وعدہ کے بعد گاندھی جی کو فرسٹ کلاس ٹکٹ مل گیا اور وہ جوہانسبرگ سے پریٹوریا کے لئے ریل کے فرسٹ کلاس میں سوار ہو گئے۔

گارڈ کی فرعونیت ایک درمیانی اسٹیشن پر گارڈ نے دیکھا کہ ایک کالا آدمی فرسٹ کلاس میں ایک انگریز کے ساتھ بیٹھا ہے۔ تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اور درجے کے سامنے آکر گاندھی جی کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ گاندھی جی بولے میرے پاس فرسٹ کلاس ٹکٹ ہے۔ مگر گارڈ نے کہا۔ ان واہیات باتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جاؤ کسی تیسرے درجہ میں جا بیٹھو۔ دیکھتے نہیں ہو یہاں ایک یورپین بیٹھا ہوا ہے۔

یہ سن کر وہ انگریز مسافر بگڑ اٹھا اور اس نے گارڈ کو آڑے ہاتھوں لیا کہنے لگا۔ تم ناحق ایک شریف آدمی کو پریشان کرتے ہو۔ اس کے پاس ٹکٹ موجود ہے پھر کیوں اسے اتارتے ہو۔

گارڈ نے تنک کر جواب دیا۔ میرا کیا حرج ہے۔ میں تو یہ سب کچھ تمہارے ہی لئے کر رہا تھا۔ اگر تم اس کالے قلی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہو تو شوق سے بیٹھو اس میں میرا کیا بگڑتا ہے۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں بکتا ہوا گارڈ واپس چلا گیا اسی دن شام کو گاندھی جی بھی بغیر کسی مزید ذلت کے پریٹوریا پہونچ گئے۔

ہندوستانیوں کی اس ذلت آمیز زندگی نے گاندھی جی کے خیالات میں ایک ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ اور وہ ہمہ تن اس تلاش میں مصروف تھے کہ آخر ان

ذیل مشکلات سے یہاں کے ہندوستانیوں کو کیونکر نجات مل سکتی ہے۔

پریٹوریا میں

اب سے چالیس پچاس برس پہلے پریٹوریا ایک معمولی سی جگہ تھی۔ اس کا ریلوے اسٹیشن بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ رات کے وقت کہیں کہیں ایک آدھ لیمپ کی روشنی ہو رہی تھی۔ گاندھی جی کو خیال تھا کہ انہیں لینے کے لئے کوئی نہ کوئی شخص اسٹیشن پر ضرور آئے گا۔ مگر وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ اب تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ ہوٹلوں وغیرہ کی حالت کا پہلے ہی سبق مل چکا تھا۔ اور یہ ذرا نامناسب سی بات تھی کہ سامان ساتھ لئے ہوئے اس شخص کی تلاش کریں جس کے نام وہ ڈربن سے سیٹھ عبداللہ کا خط لائے تھے۔

گاندھی جی پلیٹ فارم پر کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ ایک امریکن حبشی نے انہیں دیکھ لیا۔ اور وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص یہاں اجنبی ہے۔ وہ قریب آیا اور اس نے انگریزی میں گاندھی جی سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے ان کے حالات معلوم کئے۔ گاندھی جی نے اصل معاملہ اُسے بتا دیا۔ حبشی نے کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ یہاں پریٹوریا میں میرے دوست کا ایک ہوٹل ہے۔ میں آپ کو وہاں پہونچائے دیتا ہوں۔ چنانچہ گاندھی جی اس کے ساتھ ہوٹل میں پہونچے۔ اس ہوٹل کا مالک ایک امریکن تھا۔ حبشی امریکن نے اُس سے علیحدہ لے جا کر کچھ باتیں کیں اور اس کے بعد وہ گاندھی جی کو اپنے ہاں اس شرط پر ٹھہرانے کے لئے راضی ہو گیا کہ یہ کمرے سے باہر نہ نکلیں اور اپنا کھانا بھی وہیں منگا کر کھائیں۔

گاندھی جی ان لوگوں کی مشکلات کو اچھی طرح جانتے تھے۔ راضی ہو گئے اور ایک کمرے میں اپنا سامان پہونچا دیا۔ ٹھہرنے کے تقریباً دو گھنٹے بعد ہوٹل کا مالک پھر آیا اور اس نے کہا کہ میں نے جو آپ سے شرط کی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ہوٹل میں زیادہ تر فرنگی آتے ہیں۔ مگر جب میں نے اُن سے ایک ہندوستانی کے قیام کا تذکرہ

کیا تو انہوں نے کچھ بُرا نہیں مانا بلکہ یہ بھی اجازت دیدی کہ وہ قلی اگر چاہے تو کھانے کے کمرہ میں آکر کھانا بھی کھا سکتا ہے۔ اس واسطے میں آپ کو مطلع کرنے آیا ہوں کہ آپ آزاد ہیں۔ جب تک چاہیں ہوٹل میں رہیں اور آزادی کے ساتھ رہیں۔

گاندھی جی کو یہ سنکر کچھ اطمینان ہوا۔ اور انہوں نے ہوٹل کے مالک سے کہہ کر اپنے لئے نباتاتی غذا تیار کرائی اور کئی وقت کے بعد پھر خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اگلے دن صبح گاندھی جی سیٹھ عبداللہ کے وکیل مسٹر اے ڈبلیو۔ بیکر سے ملے۔ مسٹر بیکر بڑے کٹر عیسائی تھے۔ وہ گاندھی جی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے معذرت کی کہ کل اتوار کے سبب اسٹیشن پر کوئی آدمی نہ پہونچ سکا آپ کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔

گاندھی جی نے اپنے قیام وغیرہ کے حالات سنائے تو مسٹر بیکر نے کہا۔ پریٹوریا میں رنگ کے تعصب کی بہت زیادتی ہے اس واسطے آپ کے قیام میں بہت سی مشکلات پیش آئیں گی۔ میں نے آپ کی آمد کا حال سنکر آپ کے قیام کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہے جہاں آپ ان تعصبانہ مشکلات سے محفوظ رہ سکیں گے۔ اور اس کے بعد یہ دونوں مقدمے وغیرہ کی گفتگو کرتے ہوئے امریکن ہوٹل پہونچے۔ جہاں سے گاندھی جی نے سامان لے کر بل ادا کیا اور مسٹر بیکر کی بتائی ہوئی جگہ کے لئے روانہ ہوئے۔

یہ جگہ اگرچہ شاندار نہیں تھی لیکن پُرامن ضرور تھی۔ یہاں ایک غریب عورت رہتی تھی جس نے اپنی آمدنی میں اضافہ ہونے کے خیال سے گاندھی جی کو پچیس روپے فی ہفتہ کرایہ پر ٹھہرالیا۔

ادھر مسٹر بیکر کی رگ مذہب بھڑک اٹھی اور انہیں گاندھی جی میں عیسائیت قبول کرنے کی صلاحیت نظر آنے لگی اور انہوں نے مذہبی معاملات پر ان سے گفتگو شروع کردی۔ وہ ایک کتابیں بھی عیسائی مذہب کے متعلق گاندھی جی کو دیکر انہیں پڑھنے کی ہدایت کی۔ مسٹر بیکر ایک عیسائی مشن کے رکن بھی تھے اور انہیں عیسائیت کی تبلیغ کا

بڑا شوق تھا گاندھی جی پر پہلی بار مسٹر بیکر کا جادو چل گیا اور وہ پرٹیوریا پہونچتے ہی عیسائی دوستوں کے ساتھ عیسائی عبادتوں میں شریک ہونے لگے۔ مسٹر بیکر کی بدولت اور عیسائی عبادتوں میں شریک ہونے سے بہت سے بڑے بڑے آدمیوں سے گاندھی جی کی دوستی ہوگئی۔ اسی زمانہ میں مسٹر کوٹس سے بھی گاندھی جی کی ملاقات ہوئی جو پرٹیوریا میں عیسائی فرقہ کے ایک ممتاز رکن تھے۔

ہندوستانیوں میں میل جول

پرٹیوریا پہونچکر گاندھی جی نے ہندوستانیوں سے بھی میل جول بڑھایا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہاں کے ہندوستانی باشندوں کو منظم کرکے کسی صورت ان مشکلات کا خاتمہ کیا جائے جو انہیں ٹرانسوال اور ناٹال میں گورے چمڑے والوں کے ہاتھوں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے وہاں کے ایک معزز مسلمان سیٹھ طیب حاجی خان محمد سے واقفیت پیدا کی سیٹھ بھی گاندھی جی کے ہم خیال ہوگئے۔ یہ صاحب پرٹیوریا کے ہندوستانیوں پر بہت کافی اثر رکھتے تھے اس لئے گاندھی جی کو ان سے اپنے خیالات میں بہت مدد ملی۔ بہت سے ہندوستانیوں سے گاندھی جی کی واقفیت ہوگئی۔

جلسہ دوستوں کا حلقہ بڑھانے کے بعد گاندھی جی نے سیٹھ کے مشورے سے طے کیا کہ ایک عام جلسہ کرکے یہاں کے ہندوستانیوں کو ان کی مشکلات کا احساس کرایا جائے اور کوئی ایسا طریقہ عمل پیدا کیا جائے جس سے ان مصائب کا جلد از جلد خاتمہ ہوسکے طیب سیٹھ نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور گاندھی جی کو ہر امکانی مدد بھی دینے کا وعدہ کیا۔ گاندھی جی نے فوراً ہی ایک اعلان کے ذریعہ ہندوستانیوں کا جلسہ مدعو کیا۔

اگرچہ افریقہ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا اور بہت کم ہندوستانی

شریک ہوئے لیکن جو لوگ بھی آئے ان کے حالات سے اندازہ ہوتا کہ وہ اپنے مصائب اور مشکلات کا کافی احساس رکھتے ہیں۔ اس جلسہ میں گاندھی جی نے بھی کوشش کر کے ایک چھوٹی سی تقریر کر ڈالی جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہم ہندوستانیوں کو اپنے کاروبار میں ہمیشہ سچائی اور دیانتداری سے کام لینا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ افریقہ میں ہندوستانیوں کی مشکلات کا سبب جہالت ہے۔ یہاں کے عام ہندوستانی باشندے ان پڑھ ہیں اور انگریزی سے واقف نہیں ہیں۔ اس واسطے مشکلات میں اور بھی زیادتی ہو گئی ہے۔ اس جلسہ میں ایک ریزولیوشن تعلیم کے لئے بھی پاس کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ آج کے بعد ہر ہندوستانی کو انگریزی تعلیم ضرور حاصل کرنا چاہئے۔ جس کے ذریعہ افریقہ میں ناتجربہ کاری اور عدم واقفیت کی مشکلات کا خاتمہ ہو سکے۔

پڑھانے کی خدمت

چونکہ افریقہ میں پڑھے لکھے اور خصوصاً انگریزی داں ہندوستانی بہت کم تھے اس لئے گاندھی جی نے بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس کافی وقت ہے اور میں یہ وقت تعلیم کے لئے صرف کر سکتا ہوں جو حضرات پڑھنا چاہیں مجھ سے خدمت لے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس جلسہ سے تین چار آدمی گاندھی جی سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جن میں سے نمایاں دو نے گاندھی جی سے استقلال کے ساتھ انگریزی پڑھی اور اتنی پڑھ لی کہ وہ روزمرہ کی بول چال کے قابل ہو گئے۔

بیداری

گاندھی جی نے جس جلسہ کی بنا ڈالی تھی اب وہ ہر مہینے ہونے لگا تھا اور پریٹوریا کے تمام ہندوستانی باشندے اس میں حصہ لیتے تھے۔ اس جلسہ کی بدولت گاندھی جی وہاں کے ہر ہندوستانی سے اور اس کی مشکلات سے واقف ہو گئے اسی طرح ہر شخص گاندھی جی کو جان گیا۔ اس میل جول سے گاندھی جی کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا جس نے آگے چل کر حکومت سے حقوق لینے کے سلسلے

میں گاندھی جی کو بہت مدد دی۔ ہندوستانیوں میں بیداری کا احساس پیدا ہوتے ہی گاندھی جی پریٹوریا کے مقیم برطانوی ایجنٹ سے ملے اور اس سے مشکلات اور مصائب کا تذکرہ کرتے ہوئے امداد مانگی۔ وہ بہت شریف آدمی تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ حکومت کے سامنے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ تاہم اس نے گاندھی جی سے ہمدردی ظاہر کی اور امکانی مدد دینے کا وعدہ بھی کیا۔

ذلیل قانون

۱۸۸۶ء کے پاس شدہ قانون کی رو سے ٹرانسوال میں اور بہت سی ذلتوں کے علاوہ ہندوستانیوں پر ایک پابندی یہ بھی تھی کہ وہ رات کو نو بجے کے بعد بغیر پاس لئے ہوئے گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اور دن رات کے ہر حصہ میں سڑک کے کنارے کی پٹری پر چلنے کی بھی ممانعت تھی۔

چنانچہ گاندھی جی بھی اس جکڑ بندی میں مجبور تھے۔ البتہ جب کبھی اپنے دوست مسٹر کوٹس کے ساتھ کہیں آتے جاتے تھے تو اُن سے باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس معاملہ کا تعلق پولیس سے تھا اس واسطے مسٹر کوٹس بھی گاندھی جی کو ساتھ رکھتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کیونکہ اس میں اُن کی گرفتاری کا خطرہ تھا۔

مسٹر کوٹس کو اگرچہ یہ اختیار تھا کہ وہ اپنے نوکروں کو پاس دے کر باہر بھیج سکتے تھے مگر وہ اختیار صرف نوکروں ہی تک محدود تھا۔ اس واسطے مسٹر کوٹس نے انہیں مستقل پاس دلانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ گاندھی جی کو اپنے ایک بیرسٹر دوست مسٹر کراؤز کے پاس لے گئے۔ مسٹر کراؤز ڈاکٹر بھی تھے اور بہت با اعتبار حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ ایک بیرسٹر بغیر پاس کے گھر سے نہیں نکل سکتا تو انہیں بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے اسی وقت ایک خط لکھ کر گاندھی جی کے حوالہ کر دیا۔ اور کہا کہ جب کبھی آپ سے

کوئی مانع ہو اس کو یہ خط اُسے دکھا دیجئے گا۔ اور اب آپ بے روک ٹوک ہر جگہ جا سکتے ہیں۔

سنتری نے مارا

مگر اس خط سے بھی وہ خطرہ دور نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس سے گرفتار ہونے کا ڈر نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی ایک موقعہ پر گاندھی جی کو سخت اذیت پہونچی۔

یہ روزانہ ہوا خوری کے لئے جایا کرتے تھے۔ اور کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی ایک دن سڑک کی پٹری پر جا رہے تھے۔ پیچھے سے ایک پہرہ دار سنتری نے آکر اس زور سے اُن کی کمر میں لات ماری کہ گاندھی جی بے چارے سڑک پر جا پڑے۔ انہیں اس سے بہت تکلیف ہوئی مگر لاچار تھے۔ فرعون کے سامنے کیا چل سکتی تھی بے چارے اُس کا مونہہ تک کر چپ ہو گئے۔ عین اسی وقت مسٹر کوٹس کہیں سے آنکلے انہوں نے یہ ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا سنتری پر بہت ناراض ہوئے۔ اور جب اس بے تمیز سنتری کو اپنی گستاخی کا احساس ہوا تو اس نے گاندھی جی سے معافی مانگ لی۔

اس افسوسناک واقعہ نے گاندھی جی کو ہندوستانیوں کی مشکلات کا ایک اور عملی تجربہ کرایا۔ اور انہوں نے سوچا کہ جب مہذب لباس والے ہندوستانیوں کی یہ حالت بنائی جا سکتی ہے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جن کے پاس کوٹ پتلون استعمال کرنے کیلئے روپیہ ہی نہیں ہے اور جو بہت سادہ اور بوسیدہ لباس پہنے باہر سڑکوں پر چلتے پھرتے ہیں۔

مسٹر کوٹس نے اگرچہ اس توہین کے لئے قانونی چارہ جوئی کی طرف بھی توجہ دلائی مگر گاندھی جی نے اسے ذاتی واقعہ کہہ کر ٹال دیا۔ اور اس کے بعد کبھی اس سڑک کی طرف نہیں گئے۔

مقدمہ

جس مقدمہ کی تیاری کے لئے گاندھی جی ہندوستان سے افریقہ آئے تھے وہ واقعات کے اعتبار سے بہت خوفناک ہو گیا تھا اور اس میں فریقین کے تباہ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ مدعی نے مدعا علیہ پر تقریباً چھ لاکھ روپے کا دعویٰ کیا تھا جو بہت سے پرامیسری نوٹ وغیرہ پر مبنی تھا۔ مدعا علیہ کا عذر یہ تھا کہ ان میں سے اکثر

دستاویز دھوکا دیکر اور لاعلمی میں لکھوائی گئی ہیں۔ ان حالات کی شہادت اور ثبوت نے اتنا طول پکڑ لیا تھا کہ مقدمہ کئی سال میں بھی ختم نہ ہوتا اور چونکہ فریقین کی طرف سے بڑے بڑے نامی وکیل اور بیرسٹر کام کر رہے تھے اس لئے دونوں طرف سے ہزارہا روپیہ بیرسٹروں کی جیب میں کھنچا چلا جا رہا تھا۔ مگر فریقین کو اس کی کچھ پروا نہ تھی۔ اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

راضی نامہ گاندھی جی نے بہت عرصہ غور کرنے کے بعد سوچا کہ اگر مقدمہ میں کسی طرح راضی نامہ ہو جائے اور کسی پنچایت کے سامنے طے ہو جائے تو اس میں دونوں کا فائدہ ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ چھ لاکھ روپے کے دعوے پر دونوں طرف سے بارہ لاکھ روپے برباد ہو جائیں گے اور پھر بھی کسی کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اپنے موکل سے بذریعہ خط و کتابت راضی نامہ کا اختیار حاصل کر لیا اور اس کے بعد فریق ثانی بھی مستقبل کے نفع نقصان کو سمجھ کر راضی نامہ کے لئے تیار ہو گیا۔ اور ایک باقاعدہ پنچایت کے سامنے مقدمہ رکھدیا گیا۔ جس نے پورے انصاف اور جد و جہد کے بعد گاندھی جی کے موکل سیٹھ عبداللہ کے حق میں اصل دعوے سے کسی قدر کم (تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ روپے) کی ڈگری دیدی۔ جسے عدالتی رو سے بھی منظور کر لیا گیا۔

بظاہر مقدمہ ختم ہو گیا مگر اب مشکل یہ تھی کہ فریق ثانی اتنی بڑی رقم یکمشت ادا نہیں کر سکتے تھے لہذا گاندھی جی نے کوشش کر کے اپنے موکل سے یہ منظور کرا دیا کہ فریق ثانی یہ رقم قسط وار ادا کر دیں۔ اور اس طرح یہ خوفناک مقدمہ تقریباً ختم ہو گیا جو اگر عدالت کے ذریعہ طے ہوتا تو یقیناً دونوں فریق گھاٹے میں رہتے اور تباہ ہو جاتے۔ مگر اس فیصلے سے ایک طرف تو سیٹھ عبداللہ کا روپیہ اور مطالبہ بھی محفوظ رہا اور دوسری جانب فریق ثانی بھی تباہی سے بچ گیا۔

واپسی

گاندھی جی کو اس پنچایتی فیصلہ سے بہت مسرت تھی وہ دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ ایک طرح سے گاندھی جی کو اس مقدمہ کی شرکت سے بہت فائدہ بھی پہونچا۔ بڑے بڑے وکیل اور بیرسٹروں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی بلکہ مقدمہ کی روزانہ بحث میں شرکت کرنے سے ان کی قانونی قابلیت بھی بڑھ گئی اور دس بیس آدمیوں کے سامنے آزادی سے بولنے کا مادہ بھی پیدا ہو گیا۔ اور یہ بات گاندھی جی کی آئندہ زندگی میں بہت کار آمد ثابت ہوئی۔ کیونکہ بولنے اور بحث کرنے کی عادت سے انہیں آگے چل کر اپنی وکالت چلانے میں بڑی آسانی ہو گئی۔

مقدمہ ختم ہو جانے کے بعد گاندھی جی پریٹوریا سے ڈربن (ناٹال) واپس آگئے جہاں سیٹھ عبداللہ نے انہیں مقدمہ کی کامیابی پر بہت مبارکباد دی اور ان کی معلمانہ قابلیت کی بہت تعریف کی۔ ڈربن میں کئی روز رہنے کے بعد گاندھی جی نے ہندوستان واپس جانے کا خیال ظاہر کیا اور کہا کہ اب میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے مجھے واپسی کی اجازت دیجئے۔ عبداللہ سیٹھ نے چند الوداعی دعوتوں کے بعد واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ کر لیا۔

اب روزانہ گاندھی جی کے اعزاز میں دعوتیں ہونے لگیں۔ اور اس طرح گاندھی جی ڈربن کے ہندوستانیوں میں بھی ہر دلعزیز ہو گئے۔ انہی دنوں گاندھی جی نے اخبار میں ایک خبر پڑھی جس میں درج تھا کہ عنقریب جنوبی افریقہ میں ایک ایسا قانون بننے والا ہے۔ جس کی رو سے افریقہ کے مقیم باشندوں کو ووٹ کے حق سے محروم ہونا پڑیگا یہ ایک ایسا خطرناک قانون تھا جس کا نتیجہ یقیناً وہاں کے ہندوستانیوں کی سیاسی موت تھی۔

گاندھی جی نے اس خطرہ کو قبل از وقت محسوس کر لیا۔ اور ایک دن دعوت میں انہوں نے سامنے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہوں نے حاضرین کو سمجھایا کہ اگر یہ قانون پاس ہو گیا تو اس سے یہاں کے رہنے والے ہندوستانیوں کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔

روک لیا

حاضرین نے کہا کہ ہم لوگ یہاں یا تو تجارتی پیشہ کرتے ہیں یا ایک بڑی جماعت مزدوروں کی ہے اس واسطے یہ سیاسی پیچیدگیاں اور ان کے نقصانات ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور جو دو چار آدمی ہم میں سے ان باتوں کو سمجھتے ہیں وہ اپنی منفعت اور مصلحتوں کی بنا پر کچھ کہتے نہیں۔ اس واسطے ہم سب چاہتے ہیں کہ آپ اپنا سفر فی الحال ملتوی کر دیں اور جنوبی افریقہ میں ہی رہ کر ہمارے لئے کچھ بچاؤ کا انتظام کریں۔

گاندھی جی اگرچہ وطن سے دور بہت گھبرا رہے تھے اور انہیں ایک ایک منٹ بھاری ہو رہا تھا۔ پھر بھی انہوں نے ہندوستانیوں پر آنے والے خطرہ کا احساس کرتے ہوئے کہا کہ میں یہاں رہ تو سکتا ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ سب لوگ میرے ہم خیال اور ہم زباں ہو کر میرا ساتھ دیں اور جو کچھ میں کہتا جاؤں وہی کرتے جائیں۔ حاضرین نے وعدہ کیا کہ وہ سب آپ کے ساتھ ہیں۔ ان میں سے ایک صاحب یہ بھی بول اٹھے کہ گاندھی جی کو اس خدمت کی فیس بھی ضرور دی جائے گی۔ اس پر گاندھی جی چونک اٹھے اور انہوں نے کہا۔ میں فیس کے لئے قومی کام نہیں کر سکتا مجھے ایسے معاوضہ کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کوشش میں جس قدر خرچ کی ضرورت ہو گی اور لٹریچر وغیرہ تیار ہو گا اس کا انتظام ضرور ہونا چاہئے۔ ہندوستانیوں نے ہر قسم کی مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور گاندھی جی نے اپنا سفر واپسی ملتوی کر دیا۔

افریقہ میں رہنے لگے

۱۸۹۳ء میں ناٹال کے ہندوستانی ایک مشہور ہندوستانی سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا کو اپنا رہنما مانتے تھے۔ حاجی محمد

گو سیاست سے پوری طرح واقف نہ تھے مگر بہت مستعد قومی خادم تھے اور ایسے معاملات میں اُن کی سوجھ بوجھ عام ہندوستانیوں سے کہیں بہتر تھی۔ گاندھی جی نے اُن سے مفصل گفتگو کی اور ایک جلسہ کا انتظام کیا۔

قومی خدمت کی ابتدار

یہاں سے گاندھی جی کی وہ زندگی شروع ہوتی ہے جو اب قوم اور وطن کی ملکیت ہے اور جسے قومی زندگی کہا جاتا ہے۔ جس نے اگرچہ تکمیل اپنے وطن میں ہی کی ہے لیکن اس کی ابتدار سمندر پار سے ہوئی تھی۔

گاندھی جی نے سیٹھ حاجی محمد حاجی دادا سے مشورے کر کے ایک جلسہ سیٹھ عبداللہ کے مکان پر کیا اور اس کا صدر حاجی محمد کو بنایا۔ اس جلسہ میں ہر قسم کے ہندوستانی موجود تھے۔ ہندو مسلمانوں کے علاوہ اکثر ہندوستانی عیسائیوں نے بھی اس جلسہ میں بہت خوشی سے شرکت کی۔

جلسہ میں گاندھی جی نے حاضرین کو مفصل کیفیت سمجھاتے ہوئے بیان کیا کہ عنقریب یہاں جو قانون بننے والا ہے وہ ہندوستانیوں کیلئے بہت مضر ہے اس واسطے ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ وہ پاس نہ ہو۔ اور چونکہ آج کل میں ہی اس قانون پر اسمبلی میں بحث ہونے والی ہے اس واسطے فوری کارروائی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ آج ہی کرنا ہوگا ورنہ اس کے بعد ہاتھ پیر مارنا بیکار ہو جائیگا۔

سب نے گاندھی جی کے خیال سے اتفاق کیا اور انہوں نے فوراً ہی ایک تار کا مضمون تیار کر کے صدر اسمبلی کو بھیجا جس کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانی اس قانون کو اپنے لئے سخت مضر سمجھتے ہیں اور بہت جلد اس کی بابت عرضداشت پیش کرنے والے ہیں اس واسطے اس قانون کی بحث کچھ روز کے لئے ملتوی کر دیجئے۔ صدر نے اس

تار کا اثر پیا اور بحث کو دو روز کے واسطے ملتوی کر دیا۔ یہ ناٹال کے ہندوستانیوں کی پہلی کامیابی تھی۔

اس کے بعد اسمبلی میں پیش کرنے کے لئے ایک مکمل عرضداشت کی تیاری کی گئی یہ کام اگرچہ دو مہینے سے کم کا نہیں تھا مگر ہندوستانیوں میں گاندھی جی نے ایک روح پھونکدی تھی، سب کے سب قوم کے نام پر جان قربان کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ عرضداشت پر تمام ہندوستانیوں کے دستخط کرانے تھے اس لئے بہت سے رضا کار اپنے اپنے خرچ پر یہ کام کرنے کو تیار ہو گئے اور اس تندہی اور جانفشانی سے کام کیا کہ تمام صوبہ سے تقریباً دس ہزار دستخط مہیا کر لئے گئے۔

ذرا اندازہ کیجئے کہ افریقہ جیسے ملک میں جہاں نہ سڑکوں کا معقول انتظام نہ سواریوں کی کثرت اور پھر دور دور پھیلے ہوئے دیہات سے دس ہزار دستخطوں کا حاصل کرنا اور وہ بھی صرف دو ہفتوں میں۔ کتنا شاندار کارنامہ ہے۔ مگر یہ سب اُس جوش و خروش کا نتیجہ تھا جو گاندھی جی اور سیٹھ حاجی محمد نے وہاں کے سہمے ہوئے ہندوستانیوں میں پیدا کر دیا تھا۔

اس عرضداشت پر گاندھی جی نے بھی اپنی پوری قابلیت صرف کر دی تھی اپنے مطلب کے دلائل اور قانونی نکات کے ذریعہ قانون کو نا قابل عمل ثابت کرنے کے لئے گاندھی جی نے اس عرضداشت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔

عرضداشت کو مکمل کرنے کے بعد اُسے اسمبلی میں بھیجدیا گیا اور اس کی ایک ہزار کاپیاں چھپوا کر تمام دنیا کے معزز اخبارات اور سیاسی لوگوں کو بھی بھیجی گئیں اس پمفلٹ کی بدولت پہلی بار ہندوستانیوں کو ناٹال کے حالات کا علم ہوا اور یہاں بھی جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں سے عام ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اس پمفلٹ پر ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا نے بہت کچھ

لکھا اور ہندوستانیوں کی حمایت کی۔ انگلستان کے مشہور اخبار لنڈن ٹائمز نے بھی ہندوستانی مطالبات کی تائید کی۔ یہ حالت دیکھ کر گاندھی جی اور ان کی پارٹی کو بہت کچھ امیدیں بندھ گئیں۔ اور قانون بنانے والی مجلس کو بھی ہندوستانیوں کی بیداری کا احساس ہوا۔ مگر ان سب حالات کے باوجود اسمبلی میں وہ قانون پاس ہو گیا۔ اور کالی قوم کی کوششوں پر زبردستی پانی پھیر دیا گیا۔

افریقہ میں مستقل سکونت

اگرچہ گاندھی پارٹی کو اس کوشش میں شکست ہوئی اور ان کی تمام محنت اور روپیہ برباد ہو گیا لیکن بیداری کی روح اپنا کام کر چکی تھی۔ اور انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہماری کوششوں کی صدائے بازگشت لنڈن اور ہندوستان وغیرہ دور دراز ممالک تک پر اپنا سکہ جما چکی ہے اور یہ سب کچھ محض گاندھی جی کی بدولت ہے اس واسطے وہاں کے عام ہندوستانیوں نے بالاتفاق گاندھی جی کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان جانے کا ارادہ قطعی ترک کر دیں اور مستقل طور پر جنوبی افریقہ میں رہ جائیں۔

گاندھی جیسے وطن کے شیدائی کو اگرچہ یہ بات شاق گزری کہ ہمیشہ کے لئے وطن سے دور رہیں۔ مگر خدمت قوم کے شوق نے عذر معذرت نہ کرنے دی۔ اور وہ اس شرط پر جنوبی افریقہ میں رہنے کے لئے تیار ہو گئے کہ وہاں ان کی معاش کا کوئی مستقل ذریعہ پیدا کر دیا جائے۔

ہندوستانیوں نے چاہا کہ خدمت قوم کے عوض گاندھی جی کو ایک مقررہ رقم ہمیشہ دی جائے مگر اس مفت کی رقم سے گاندھی جی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں قومی خدمت کا معاوضہ ہرگز نہیں لے سکتا۔ تب وہاں کے ہندوستانیوں نے ان کی وکالت کو ترقی دینے اور مقدمے مہیا کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اس پر گاندھی جی نے

مستقل قیام کا فیصلہ سنا دیا۔

وکالت شروع کردی جنوبی افریقہ میں مستقل سکونت کے لئے اور پھر وکالت کے چلانے کے لئے کافی روپے کی ضرورت تھی۔ شاندار مکان اور اس کے مطابق فرنیچر وغیرہ کا انتظام یہ تمام باتیں روپے کی محتاج تھیں۔ اس لئے عبداللہ سیٹھ نے گاندھی جی کو وہ رقم ادا کردی جس کا مقدمہ کی ابتدا میں وعدہ کیا گیا تھا۔ گاندھی جی کو اس رقم سے بہت فائدہ پہونچا۔ وقت پر تمام ضروریات پوری ہوگئیں۔ ایک علیحدہ مکان لے کر اُسے فرنیچر وغیرہ سے آراستہ کرلیا گیا۔ اور اس طرح نہایت شان کے ساتھ وکالت کی ابتداء ہوئی۔

وکیلوں کی مخالفت مگر جوں ہی وہاں کے وکیلوں نے سنا کہ ایک کالا آدمی یہاں بیرسٹری شروع کرنے والا ہے اور اس سے بہت سے ہندوستانی مانوس ہوگئے ہیں تو انہوں نے اپنی انجمن کا جلسہ کرکے اس کالے آدمی کی مخالفت شروع کردی۔

چند دن بعد گاندھی جی کو وہاں کی انجمن وکلاء کی طرف سے ایک نوٹس ملا کہ اگر تم نے یہاں کے وکیلوں میں اپنا نام درج کرانے کی کوشش کی تو تمہاری سخت مخالفت کی جائے گی۔ اس واسطے اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ اس انجمن کے معتمد عبداللہ سیٹھ کے دوست تھے اس لئے انہوں نے عبداللہ سیٹھ کو پیغام بھیجا کہ اس نئے وکیل کو میرے پاس بھیجدو۔

گاندھی جی اس شخص سے ملے اور وہ ان کے حالات سنکر مطمئن ہوگیا۔ تب گاندھی جی نے وہاں کے چیف جسٹس کی عدالت میں بیرسٹری کی درخواست پیش کردی۔ لیکن انجمن وکلاء نے اپنے معتمد کا کہنا نہیں مانا اور فوراً ہی عدالت میں مخالفت کے مضمون کی عذرداری داخل کردی جسے انگریز چیف جسٹس نے خارج

کردیا اور گاندھی جی کو بیرسٹری کی اجازت دیدی۔ مگر اس شرط پر کہ گاندھی جی کو عدالت کی ہر پابندی کا احترام کرنا ہوگا اور انہیں عدالت میں داخل ہوتے وقت اپنی پگڑی کے استعمال کی اجازت نہیں ہوگی۔ گاندھی جی نے یہ تمام شرائط منظور کریں۔ حالانکہ گاندھی جی کو عدالت کا یہ حکم کچھ اچھا نہ معلوم ہوا اور ان کے ساتھیوں کو بھی گاندھی جی کی اس منظوری سے اذیت پہونچی مگر گاندھی جی نے اپنے دوستوں کو یہ کہہ کر اطمینان دلادیا کہ اپنی قوت کو ایسے معمولی جھگڑوں پر برباد نہ کرنا چاہیئے۔

ہندوستانی انجمن

رفتہ رفتہ گاندھی جی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ قومی کام کرنے اور اُسے منظم طریقے سے انجام خیز بنانے کے لئے ایک متحدہ اور باضابطہ انجمن کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کسی مستقل ادارہ کے بغیر قومی معاملات پر پوری طرح کوشش نہیں کی جاسکتی لہذا گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو جمع کرکے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور بہت جلد ایک ایسی انجمن کی بنیاد ڈال دی گئی جس پر وہاں کے تمام ہندوستانیوں کو پوری طرح اعتبار ہو اور بلا امتیاز ہر شخص اس انجمن کو اپنا ہمدرد اور نمائندہ سمجھے۔ اسی مناسبت سے گاندھی جی نے مشوروں کے بعد اس انجمن کا نام "ناٹال انڈین کانگریس" رکھا اور اس کے لئے قواعد وضوابط مرتب کرکے حاضرین سے منظور کرالئے۔

روپے کی ضرورت ہندوستانیوں نے اس انجمن سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا ہر شخص نے بڑی خوشی سے اس کی ممبری قبول کرکے چندہ دیا تمام صوبہ میں اس جماعت نے اپنے رضاکار بھیجکر دور دراز کے دیہاتیوں اور دوسرے شہر والوں کو ممبر بنایا اور اس طرح ناٹال انڈین کانگریس چند ہی روز میں بہت مضبوط جماعت بن گئی۔ خود گاندھی جی نے بھی اس میں پندرہ روپے ماہوار چندہ کا وعدہ

کیا اور جماعت کے اراکین نے انہیں ناٹال انڈین کانگریس کا سکریٹری مقرر کر دیا۔

جدوجہد کانگریس کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔ اسی زمانہ میں گاندھی جی نے بحیثیت سکریٹری ناٹال انڈین کانگریس دو مشہور پمفلٹ لکھ کر مفت تقسیم کئے جن میں سے ایک میں وہاں کے ہندوستانیوں کی بے کسی اور مصائب کی مفصل داستان تھی اور دوسرے میں نئے قانون کی ظالمانہ کیفیت چونکہ یہ پمفلٹ ایک منظم جماعت کی طرف سے ذمہ داری کے ساتھ شائع ہوئے تھے اس لئے جنوبی افریقہ میں ایک ہل چل مچ گئی اور وہاں بہت سے نیک طینت انگریز بھی ہندوستانیوں کے دوست ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی جنوبی افریقہ کے باشندوں سے کھلم کھلا ہمدردی ظاہر ہونے لگی۔

اگرچہ ناٹال انڈین کانگریس اپنے قواعد کی رو سے تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت تھی مگر اس میں ایک خامی بھی تھی اور وہ یہ کہ مزدور پارٹی کا اس انجمن میں نہ کوئی ممبر تھا اور نہ کوئی ایسا طریقہ سمجھ میں آسکا تھا جس کے ذریعہ وہاں کے غیر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو کانگریس کی اہمیت بتائی جا سکے اور انہیں اس کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔

مزدور بھی شامل ہو گئے گاندھی جی نے ہر چند کوشش کی کہ کسی طرح مزدور پارٹی کانگریس کے قیام کو مفید سمجھ کر اُسے اپنا سمجھنے لگے لیکن جہالت نے مزدوروں کو کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا۔

اور جب خدا کو منظور ہوتا ہے کہ بگڑے ہوئے کام بن جائیں تو اس کی صورتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات کہ گاندھی جی کے محلہ میں رہنے والا ایک غریب ہندوستانی مزدور کسی انگریز کے ہاں نوکر تھا۔ انگریز نے کسی بات پر اپنے نوکر کو اتنا مارا کہ اس غریب کے دانت تک ٹوٹ گئے اور جسم بھی جگہ جگہ سے لہو لہان ہو گیا

تو وہ مزدور گاندہی جی کے پاس اپنی حالت دکھانے آیا اور اس نے تمام کیفیت گاندہی جی سے بیان کی۔

گاندہی جی کو اس کی دردناک حالت دیکھ کر بہت صدمہ ہوا۔ اور انہوں نے اس کو ڈاکٹر کے پاس بھیجکر ڈاکٹری سارٹیفکٹ حاصل کر لیا اور اگلے ہی دن عدالت میں انگریز آقا کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ جہاں سے فوراً ہی ملزم کے نام سمن جاری ہو گئے۔

یہ زخمی مزدور مدراس کا رہنے والا تھا اور افریقہ میں اس کی حیثیت پابند[۱] مزدور کی سی تھی۔ اس لئے آقا خواہ کتنا ہی ظلم کرے۔ کتنا ہی ستائے مزدور کو یہ حق نہیں تھا کہ اس کی شکایت کر سکے یا اس سے علیحدہ ہو سکے۔ اس واسطے اس مدراسی مزدور کو مصیبت سے نجات دلانے کا یہی ذریعہ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس سفید اور ظالم آقا سے علیحدہ کر لیا جائے۔

تمام حالات پر غور کرنے کے بعد گاندہی جی اس ظالم سے ملے اور مفصل گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اس سے کہا کہ آپ اس مزدور کو اپنے ہاں سے آزاد کر دیں۔ ظالم انگریز اگرچہ اپنی دشواریوں کا احساس کر کے اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ اس ملازم کو اپنے ہاں سے علیحدہ کر دے گا مگر مشکل یہ تھی کہ یہ مزدور الگ ہونے کے بعد بھی کسی سفید آقا کے ہاں نوکری کرنے پر مجبور تھا اور چونکہ یہ شخص اپنے پہلے آقا کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اس واسطے کسی ایسے گورے کی تلاش ضروری تھی جو اس غلام کو آقا سے خرید لے۔ چنانچہ گاندہی جی نے کوشش کر کے ایک انگریز کو راضی کر لیا۔

---

[۱] ۱۸۹۵ء میں جنوبی افریقہ میں پابند مزدور وہ لوگ کہلاتے تھے جو ایک معاہدہ کی رو سے اپنے آقا کے زر خرید غلام ہو جاتے تھے اور اس کے بعد وہ صرف اسی آقا کے رحم و کرم پر ہوتے تھے انہیں عدالتی دروازوں سے بھی ٹھوکریں ہی ملتی تہیں۔

اور اس طرح مدراسی مزدور کو مصائب سے ایک حد تک نجات مل گئی۔

گاندھی جی کی اس شاندار کوشش کی خبر تمام مزدوروں میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور اب وہ سمجھے کہ دنیا میں ان کا کوئی ہمدرد بھی موجود ہے۔ چنانچہ ہزارہا مزدور گاندھی جی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور انہیں اپنا سرپرست سمجھنے لگے۔ اس طرح گاندھی جی کو اپنے مشن میں خود بخود ایک ایسی امداد مل گئی جس کے لئے کوئی حل ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس کے علاوہ اس شاندار فتح کی اطلاع ہندوستان تک پہونچی اور یہاں بھی لوگوں نے پہلی بار گاندھی جی کی تعریف کی۔ اس واقعہ کے بعد مزدور پارٹی بھی کانگریس کے کام کو اپنا سمجھنے لگی۔

خوفناک محصول

اسی زمانہ میں حکومت ناٹال نے مزدوروں پر ایک خوفناک محصول عائد کیا جس کی رو سے ہر ہندوستانی مزدور یا تو ناٹال سے چلا جائے ورنہ اس پر پچیس پونڈ (تقریباً پونے چار سو روپے) ماہانہ کا ٹیکس عائد ہوگا۔

گاندھی جی کو اس ہولناک ٹیکس نے حیرت میں ڈال دیا۔ ایک ایسا مزدور جو بیس پچیس روپے ماہوار کماتا ہو کیونکر اتنا خوفناک ٹیکس دے سکتا ہے اور پھر یہ ٹیکس گھر میں ایک آدمی پر نہیں بلکہ جتنے بھی بالغ آدمی گھر میں ہوں ان سب پر عائد ہوتا ہے۔

ان حالات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد گاندھی جی نے فوراً کانگریس کا جلسہ طلب کیا اور کہا کہ اگر اس ٹیکس کی مخالفت جلدی نہ کی گئی تو جنوبی افریقہ میں ہندوستانی مزدور بے موت مر جائیں گے۔ ایک متفقہ رائے سے انہوں نے فوراً اس کی کارروائی شروع کر دی۔ گورنمنٹ ناٹال کے پاس احتجاجی نوٹ بھیجا گیا اور دوسری موثر کوششیں کی گئیں اور خدا کا شکر ہے کہ ناٹال انڈین کانگریس کی بدولت وہاں کے مزدور اس

مصیبت عظمیٰ سے بال بال بچ گئے مگر پھر بھی تقریباً بیتالیس روپے کا ٹیکس قائم رہ گیا جسے ناٹال کانگریس نے سالہا سال کی کوششوں اور قربانیوں کے بعد دور کرایا۔

عیسائی خاندان سے دوستی

اسی دوران میں گاندھی جی کا میل جول بہت وسیع ہو گیا۔ اور وہ مختلف مذاہب کے لوگوں سے ملتے رہے۔ کبھی کبھی گرجا بھی جاتے تھے۔ وہاں ان کی دوستی ایک عیسائی خاندان سے ہو گئی۔ اس کے افراد گاندھی جی سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے گاندھی جی کو ہر اتوار کی دعوت کے لئے اپنے ہاں مدعو کیا۔

اس طرح گاندھی جی اتوار کے دن انہی لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگے انہیں ہمیشہ بچوں سے محبت رہی ہے۔ اس خاندان میں ایک پانچ چھ برس کا بچہ بھی تھا۔ گاندھی جی اس بچہ سے بہت ہنستے بولتے تھے۔ وہ بچہ بھی گاندھی جی سے بہت محبت کرنے لگا تھا۔

لڑائی ہو گئی

ایک روز گاندھی جی میز پر کھانا کھا رہے تھے۔ انہی کے سامنے دوسری کرسی پر وہ بچہ بیٹھا تھا۔ گاندھی جی کے سامنے رکابی میں سیب کے کچھ ٹکڑے تھے اور بچہ کی رکابی میں گوشت تھا۔ گاندھی جی نے بلا کسی خیال کے محض خوش مذاقی میں بچہ سے کہا۔ دیکھو میرے سامنے سیب ہے اور یہ بہت مفید چیز ہے اس کے خلاف تمہارے سامنے گوشت ہے اور یہ بہت بُری چیز ہے اسے کھا کر آدمی بُرا ہو جاتا ہے۔

وقت کی بات کہ بچے کے دل پر اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اور اس نے کہا ہم اب گوشت نہیں کھایا کریں گے اور اس کے بعد عرصہ تک اس بچہ نے گوشت سے نفرت کی۔ یہ حال دیکھ کر بچہ کی ماں کو بہت افسوس ہوا اور اس نے سوچا کہ گاندھی جی کا یہاں آنا مفید نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دن اس عورت نے گاندھی جی سے

صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارے بچہ پر آپ کی تعلیم کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اور ہم اسے پسند نہیں کرتے۔ اس واقعہ کے بعد گاندہی جی کبھی اس عیسائی گھرانے میں نہیں گئے

افریقی مکان میں

چونکہ گاندہی جی کے خیال میں ایک ہندوستانی بیرسٹر اور قومی نمائندے کو بہت شان وشوکت کے ساتھ رہنے کی ضرورت تھی اس واسطے ان کا خرچ بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے اب امیروں کے محلہ میں ایک خوبصورت مکان بھی کرایہ پر لیا تھا اور اس کو بیرسٹری کی شان کے مطابق پوری طرح آراستہ کر لیا تھا۔

درحقیقت دیکھنے والوں پر انسان کے طرز رہائش کا بھی اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ اچھا کھانے اور معمولی پہننے کے قائل ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ لوگ انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کے خلاف جو لوگ اچھا پہننے اور معمولی کھانے کے قائل ہیں دنیا ان کی عزت بھی زیادہ کرتی ہے اور ان کی بات کا اثر بھی لیا جاتا ہے اس واسطے ایک قومی نمائندہ کی حیثیت سے گاندہی جی نے جو کچھ کیا اچھا کیا اور اس کا ان کی بیرسٹری پر بھی خوشگوار اثر پڑا اور لیڈری بھی ممتاز ہو گئی۔

بدمعاش دوست کی حرکت

مسٹر گاندہی ہمیشہ ہی اس عیب میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ اپنے ہر دوست پر بلکہ جاننے پر بہت جلد بھروسہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ ان کی بہت ہی سادگی ہے اور اسے نیکی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ اس نیکی نے ہمیشہ ہی گاندہی جی کو نقصان پہونچایا ہے اس واسطے میرے خیال میں یہ نیکی نہیں بلکہ عیب ہے۔

جس مکان میں گاندہی جی رہتے تھے وہ کافی بڑا تھا۔ اور ایک دو آدمی اس میں رہتے ہوئے بظاہر کچھ بھلے معلوم نہ ہوتے تھے۔ اس لئے گاندہی جی نے اپنے

ایک دوست کو ساتھ رکھ لیا اور وہ بھی اسی مکان کے اوپر والے حصہ میں رہنے لگا یہ شرکت صرف دوستانہ تھی۔ گاندھی جی کی کوئی غرض اس میں شامل نہیں تھی اس کے بعد یہ دوستی اتنی بڑھی کہ ساتھ ہی کھانا پینا ہوگیا اور اکثر ساتھ ہی رہنے لگے۔

گھر میں فاحشہ

ایک دن گاندھی جی کا باورچی دوڑتا ہوا ان کے دفتر میں پہونچا اور گاندھی جی سے کہا کہ اگر آپ اسی وقت گھر چلیں تو آپ وہاں ایک نیا رنگ دیکھیں گے۔ گاندھی جی نے حیرت سے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ وہ بولا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ آپ کے سامنے کچھ کہہ سکوں۔ آپ چل کر اپنی آنکھوں سے تماشہ دیکھ لیجئے۔ گاندھی جی طرح طرح کے خیال دل میں لئے ہوئے گھر پہونچے۔

باورچی نے اوپر کے کمرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کمرہ میں دیکھ لیجئے کون ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ اب گاندھی جی کچھ سمجھے اور انہوں نے کمرہ پر دستک دی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ کئی آوازیں دینے کے بعد دوست نے اندر سے کمرہ کھول دیا اُس کے چہرہ پر اس وقت ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

گاندھی جی نے دیکھا کہ ایک فاحشہ عورت کمرہ میں موجود ہے۔ وہ گاندھی جی کو دیکھ کر بالکل نہیں ڈری۔ خاموشی کے ساتھ پلنگ پر بیٹھی رہی۔ یہ کیفیت دیکھ کر گاندھی جی کو بہت طیش آیا اور انہوں نے فاحشہ کو فوراً ہی گھر سے نکال دیا اور اس کے بعد دوست سے شکایت کی کہ مجھے افسوس ہے آپ نے میری دوستی اور بھروسہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔

دوست کو نکال دیا

دوست کو اگرچہ اس افشائے راز سے بہت شرمندگی ہوئی مگر وہ کچھ سخت گفتگو کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس پر گاندھی جی نے اس سے بھی گھر خالی کر دینے کو کہا۔ لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تب گاندھی جی نے پولیس کی دھمکی دیکر اس دوست کو بھی گھر سے نکال دیا۔

بعد کو تحقیقات پر پتہ چلا کہ اس سے پہلے بھی بہت سی عورتیں اسی طرح گھر میں لائی جا چکی نہیں مگر نوکروں کی اتنی ہمت نہ تھی کہ دوست کی شکایت گاندھی جی سے کریں۔ کیونکہ وہ اپنے دوست پر بہت اعتبار اور بھروسہ کرتے تھے۔

بیوی بچوں کی یاد

گاندھی جی کو افریقہ گئے ہوئے تقریباً تین سال ہو چکے تھے۔ وہاں ان کی وکالت کا کام بھی خوب چل نکلا تھا اس کے علاوہ قومی خدمات کے باعث بھی اب وہ مستقل طور پر افریقہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اس واسطے اب ہمیشہ ہی افریقہ میں رہنا تھا۔ تین سال کی علیحدگی کے باعث بیوی بچوں کی یاد ستانے لگی۔ اس لئے گاندھی جی نے اہل وعیال کو بھی افریقہ لے جانے کا فیصلہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جب مجھے مستقل طور پر ہی یہاں رہنا ہے تو میں بال بچوں کو بھی یہاں لانا چاہتا ہوں۔

ہندوستان کو روانگی

مگر اس سکیم میں ایک مشکل تھی کہ اگر گاندھی جی کچھ عرصہ کے لئے ڈربن سے غیر حاضر ہو جائیں گے تو اتنے دن تک ناٹال انڈین کانگریس کا کام کون سنبھالے گا۔ کئی روز غور کرنے کے بعد گاندھی جی نے ایک ہوشیار ہندوستانی مسلمان کو اس کے لئے منتخب کیا اور انہیں سکریٹری مقرر کر کے خود ہندوستان کے لئے ایک ایسے جہاز سے روانہ ہو گئے جو کلکتہ جا رہا تھا۔

جہاز میں کچھ انگریزوں کے علاوہ گاندھی جی کی دوستی کپتان سے بھی ہو گئی اور یہ تمام سفر بہت آرام سے گزرا۔ اسی جہاز میں گاندھی جی نے کچھ اردو بھی پڑھنی سیکھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ بغیر اردو کی واقفیت کے مسلمانوں سے میل جول میں بہت دقت ہوتی ہے۔

ایک مہینہ سے کچھ کم کا یہ سفر بہت اطمینان سے گزر گیا اور گاندھی جی کلکتہ کی بندگاہ تک بخیریت پہونچے اور وہاں سے اُسی دن راجکوٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

الہ آباد میں راجکوٹ جاتے ہوئے ٹرین الہ آباد پر تقریباً ایک گھنٹہ ٹھیرتی تھی گاندھی جی اس خالی وقت سے فائدہ اٹھانے کے لئے شہر کی سیر کو چلے گئے۔ مگر اچھا کیا کہ جاتے وقت اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دیتے گئے۔

الہ آباد کی سیر میں انہیں گاڑی کی روانگی کا صحیح اندازہ نہ رہا اور جب وہ واپس اسٹیشن پہونچے تو گاڑی چھوٹ چکی تھی اور اسٹیشن ماسٹر نے ان کا سامان اتروا کر رکھ لیا تھا۔ اس طرح گاندھی جی کو الہ آباد میں ٹھیرنے کیلئے ایک دن مل گیا بیٹھے بیٹھے انہوں نے سوچا کہ اگر الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار پانیر کی امداد انہیں حاصل ہو جائے تو افریقہ کے ہندوستانیوں کی مشکلات کا جلد خاتمہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ٹیلیفون کے ذریعہ ایڈیٹر سے اپنی آمد کا حال اور الہ آباد میں اتفاقیہ ٹھہر جانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ملاقات کی درخواست کی۔ ایڈیٹر پانیر نے اُسی وقت انہیں دفتر میں بلا لیا۔ اور بہت اخلاق کے ساتھ پیش آیا۔

گاندھی جی نے جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں کی مشکلات اور ان کے مصائب کا حال تفصیل کے ساتھ اُسے سنا کر کہا کہ اس معاملہ میں آپ کو ہندوستانیوں کا ساتھ دینا چاہیئے اُس نے ایک حد تک امداد کا وعدہ کر لیا اور گاندھی جی اُس کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے۔

وطن میں بقیہ وقت الہ آباد کی مختلف تفریحات میں گزار کر گاندھی جی راجکوٹ پہونچے۔ اور بڑی مدت کے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملاقات ہوئی یہاں بھی گاندھی جی اپنے فرض کو نہیں بھولے اور دن رات یہی فکر رہنے لگی کہ کسی

طرح جلد سے جلد جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کو ذلت کی زندگی سے نجات دلانی چاہیئے۔

گرین پمفلٹ

کئی روز غور و خوض کے بعد گاندھی جی نے ایک لمبا چوڑا مضمون تیار کیا اور اُسے ایک پمفلٹ کی صورت میں دس ہزار چھپوا کر تمام ملک میں تقسیم کرایا۔ اس پمفلٹ میں افریقی ہندوستانیوں کی زندگی کا ہو بہو نقشہ کھینچ کر ہندوستانی لیڈروں اور اخبارات سے امداد کی اپیل کی گئی تھی۔ اس پمفلٹ پر سبز رنگ کا سرورق تھا۔ اسی مناسبت سے لوگوں نے اس کا نام گرین پمفلٹ رکھدیا۔

افریقہ تک گونج

اس پمفلٹ سے تمام ہندوستان میں گاندھی جی کے کارناموں کی شہرت ہونے کے علاوہ یہاں کے اخبارات اور لیڈروں کو بھی افریقہ کے مظلوم ہندوستانیوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اخبار پانیر نے بھی اس میں حصہ لیا۔ اور کئی تائیدی نوٹ لکھے مگر ریوٹر ایجنسی نے تو غضب ہی کر دیا۔ اُس نے اس پمفلٹ کا ایسا غلط ترجمہ کیا جس کا مطلب اصل مضمون سے ہی جدا ہوگیا۔

پمفلٹ کا بہت ہی مختصر ترجمہ کرکے ریوٹر نے افریقہ کے اخبارات کو یہ تار بھیجا کہ گاندھی جی نے ہندوستان پہونچکر ایک پمفلٹ شائع کیا ہے اور اس میں ہندوستانیوں کو افریقہ والوں کے خلاف بھڑکایا ہے اور لکھا ہے کہ جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کو افریقی باشندے درندوں کی طرح ستاتے ہیں اور ان پر وحشیانہ ظلم کرتے ہیں۔ جب یہ خبر افریقی اخبارات میں چھپی تو وہاں کے گورے باشندے گاندھی جی کے دشمن ہوگئے۔ مگر گاندھی جی کو اس نئی دشمنی کا کوئی علم نہیں ہوا اور وہ ہندوستان میں بدستور اپنے مقاصد کے لئے کوشش کرتے ہوئے

وہ یہاں کے مقتدر لیڈروں اور دوسرے سیاسی رہنماؤں سے ملے اور ان کی معرفت بمبئی پونا اور مدراس وغیرہ مقامات پر جلسے بھی کرائے اور اس میں خود بھی تقریریں کیں۔ اس طرح عوام میں افریقہ کے ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

برطانیہ کا قومی گیت

یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی انگریزوں کی حکومت سے بدظن نہیں تھے بلکہ ایک حد تک اس گورنمنٹ کو بہت اچھا سمجھتے تھے اور تاج برطانیہ کے وفادار کہلاتے تھے۔ گاندھی جی فرماتے ہیں کہ:۔

"اُس زمانہ میں میرا یہ خیال تھا کہ مجموعی حیثیت سے برطانوی حکومت محکوموں کے لئے مفید ہے"

یہی کیفیت انگریز حکومت کے ساتھ اُن کی وفاداری کی بھی تھی۔ حکومت پرستی میں وہ بہت پیش پیش تھے۔ اور کوئی موقع وفاداری کے اظہار کا خالی نہ چھوڑتے تھے۔ ایک مرتبہ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے انتظامات میں گاندھی جی نے بہت نمایاں حصہ لے کر انگریز حکومت کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور اکثر لوگ انکو خدمت قوم کے باوجود انگریز پرست سمجھتے تھے خود گاندھی جی نے اپنی سرکار پرستی کے متعلق فرمایا کہ:۔

"رنگ اور نسل کا جو تعصب مجھے جنوبی افریقہ میں نظر آیا اسے میں برطانوی روایات کے منافی سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض ایک مقامی اور عارضی چیز ہے۔ اس لئے میں تاج برطانیہ کی وفاداری میں انگریزوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے بڑی محنت سے نیشنل[1] انتھیم کا راگ سیکھا اور

---

[1] برطانیہ کا قومی گیت۔

جب کبھی یہ گیت گایا جاتا تھا میں بھی ساتھ دیتا تھا۔"

گاندھی جی نے اس گیت میں کچھ مٹھاس محسوس کی اور اپنے بچوں کو بھی یاد کرایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی کو انگریز حکومت کے خلاف تعصب نے نہیں بلکہ مصائب اور مظالم نے اُبھار رکھا ہے۔ ورنہ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ گاندھی جی انگریز حکومت کو پسند کرتے تھے اور کبھی اس کی مخالفت نہیں کی۔

واپسی افریقہ

گاندھی جی اپنے مقاصد کا پروپیگنڈہ کرنے میں پوری طرح مصروف تھے۔ یہاں کے اخبارات اور لیڈروں کو تقریباً اپنا ہم خیال بنا چکے تھے۔ مگر ابھی انہیں بنگال کا دورہ کرنا باقی تھا۔ چنانچہ وہ کلکتہ پہونچے اور وہاں کے اخبارات کے ایڈیٹروں اور دوسرے پبلک کام کرنے والوں سے ملے اور اُن سے ناٹال کے مظالم کی کہانی سنا کر امداد طلب کی۔

کلکتہ میں بھی جلسہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عین اسی وقت گاندھی جی کے نام افریقہ سے فوراً واپس آجانے کا تار ملا۔ اور وہ اپنے احباب سے جلسہ کرنے اور دوسری کارروائیوں کو مکمل کرنے کا وعدہ لے کر فوراً راجکوٹ واپس آئے۔ اور وہاں سے بیوی بچوں کو ساتھ لے کر بمبئی پہونچے جہاں عبداللہ کمپنی کا جہاز انہیں تیار مل گیا۔ چونکہ اس کمپنی سے گاندھی جی کے دوستانہ تعلقات تھے اس لئے ان کے خاندان کو فرسٹ کلاس میں اعزازی جگہ مل گئی۔

اس جہاز کے ساتھ بمبئی سے ایک جہاز اور بھی روانہ ہوا۔ یہ دونوں بغیر کسی درمیانی بندرگاہ پر ٹھہرے سیدھے ناٹال جانے والے تھے۔ اور دونوں میں تقریباً آٹھ سو ہندوستانی مسافر تھے۔

طوفان دسمبر کے مہینے میں بحر ہند میں کافی طوفان ہوتا ہے۔ مگر یہ دونوں جہاز اطمینان کے ساتھ سفر طے کر رہے تھے۔ کہ یکایک بہت زور شور کی آندھی آگئی۔ اور دونوں جہاز خطرے میں پڑ گئے۔ مسافروں میں قیامت کی سی ہلچل مچ گئی۔ توبہ واستغفار کا ایک پُرخلوص منظر سامنے آگیا۔ ہر شخص حضوری قلب کے ساتھ سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

گاندھی جی اس طوفان سے زیادہ متاثر نہ تھے وہ اس سے پہلے بھی کئی بار جہاز کا سفر کر چکے تھے۔ اس واسطے مسافروں کو تسلی دیتے رہے اور دوسرے جہاز پر بھی کشتی کے ذریعہ پہونچے اور وہاں کے مسافروں کو اطمینان دلایا کہ یہ آندھی مضبوط جہازوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ آپ لوگ اطمینان سے بیٹھے رہئے کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔

اس ہمدردی سے دوسرے جہاز کے تمام مسافر بھی گاندھی جی کے شناسا ہو گئے۔ اور انہیں ایک حد تک سکون محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد آندھی ختم ہو گئی اور دونوں جہاز روانہ ہوتے۔ ناٹال کی بندرگاہ سے تھوڑی دور پہلے ہی دونوں جہازوں کو رک جانے کا حکم ملا۔ اور بتایا گیا کہ یہ جہاز بمبئی سے آرہے ہیں جہاں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ اس واسطے دونوں کو پانچ روز قرنطینہ کے ماتحت یہیں ٹھہرنا ہوگا۔

ڈربن میں ہلچل

درحقیقت قرنطینہ کا تو ایک بہانہ تھا ورنہ بات یہ تھی کہ ڈربن کے یورپی باشندے گاندھی جی کی بابت بہت کچھ سن چکے تھے۔ اخبارات کے ذریعہ انہیں معلوم ہوا تھا کہ گاندھی جی نے ہندوستان میں یورپی باشندوں کو بہت ظالم

کہاہے اوران کوبہت بدنام کیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ گاندھی جی کی اُن کوششوں کاحال بھی سن رہے تھے جو وہ ہندوستان میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کے لئے کر رہے تھے۔ اس واسطے یورپی لوگوں کو گاندھی جی سے خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اور وہ انہیں افریقہ کے لئے ہوّا سمجھنے لگے تھے۔

اور پھر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ گاندھی جی اس مرتبہ ہندوستان سے دو جہاز ہندوستانیوں کے بھر کر اپنے ساتھ لائے ہیں تو وہ حیران رہ گئے اور یہ سمجھے کہ گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کو ہندوستانیوں سے بھر دینے کا فیصلہ کرلیا ہے ان خیالات نے ڈربن میں ہندوستانیوں کے خلاف بری طرح شورش پھیلادی اور وہ ہر طرح کی جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔

اس دلیری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت ناٹال ان کا آزادی کے ساتھ تعاون کر رہی تھی اسی ہمت پر انہوں نے دونوں جہازوں کو واپسی کا مشورہ بھیجا مگر جہاز والوں نے واپسی سے انکار کردیا اور کہا کہ ہم بندرگاہ پر ضرور اتریں گے اس میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہوسکتی۔

یہ جواب سنکر ڈربن والوں نے طرح طرح کی دھمکیاں دینی شروع کیں اور کہا کہ اگر جہاز واپس نہیں جائیں گے تو ان کو ڈبو دیا جائے گا۔ اس واسطے جان کی سلامتی چاہو تو ہندوستان لوٹ جاؤ۔ اس دھمکی کے ساتھ ہی یہ مہربانی کی کہ واپسی کا کرایہ دینے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

گاندھی جی ان تمام حالات پر غور کر رہے تھے۔ دونوں جہاز کے مسافروں نے گاندھی جی کو اپنا رہنما تسلیم کرکے کہا کہ جو ارادہ ان کا ہوگا اس پر عمل کیا جائیگا اگر گاندھی جی کہیں تو ہم واپس چلنے کو تیار ہیں مگر گاندھی جی نے کہا کہ یہ بات خودداری کے خلاف ہے۔ ہم واپس ہرگز نہیں جائیں گے۔

اس کشمکش سے ڈربن میں دو فریق بن گئے۔ ایک طرف عام ہندوستانی اور چند منصف مزاج انگریز تھے جو یہ چاہتے تھے کہ جہاز کے مسافر ڈربن میں داخل ہو جائیں اور دوسری پارٹی اُن متعصب یورپی لوگوں کی تھی جو ڈربن کو اپنا وطن سمجھ کر ہندوستانیوں کے داخلہ پر پابندی چاہتے تھے

بہر حال پانچ روز تک یہی آفت مچی رہی۔ طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں مگر سخت جان گاندھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور انہوں نے بندرگاہ پر اترنے کا قطعی ارادہ کر لیا۔ پانچویں دن قرنطینہ ختم ہوا تو جہاز پلیٹ فارم پر لائے گئے۔

گاندھی جی پر حملہ

ہندوستانیوں کی آمد سے ڈربن کے یورپی باشندے بہت ہی مشتعل تھے۔ انہیں ہرگز یہ گوارا نہیں تھا کہ ہندوستانیوں کی ان کے ملک میں کثرت ہو۔ اس واسطے جہازی اسٹیشن کے باہر یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر شور مچانے لگے اور ان میں سے چند لوگ گاندھی جی کے قتل کا ارادہ لے کر آگے بڑھے۔

گاندھی جی کے دوستوں نے وقت کی انتہائی نزاکت اور خطرہ کا احساس کر کے گاندھی جی کو رائے دی کہ دن بھر جہاز میں ٹھہر کر رات کو اندھیرے میں شہر میں داخل ہوں۔ مگر عبداللہ کمپنی کے مشیر قانونی مسٹر لاٹن نے کہا کہ گاندھی جیسی شخصیت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ چوروں کی طرح چھپ کر ڈربن میں داخل ہوں۔ اس لئے یہ رائے قرار پائی کہ گاندھی جی اپنے بیوی بچوں کو ایک گاڑی میں بٹھا کر کسی ہندوستانی دوست کے ہاں بھیج دیں اور گاندھی جی خود مسٹر لاٹن کے ساتھ کسی محفوظ راستہ سے پیدل روانہ ہوں۔

چنانچہ گاندھی جی نے بیوی بچوں کو اپنے دوست رستم جی کے ہاں روانہ کر دیا۔ رستم جی کا مکان بندرگاہ سے تقریباً دو میل تھا۔ اور خود مسٹر لاٹن

کے ساتھ پیدل چل دئے۔ اگرچہ یہ لوگ ایک محفوظ راستہ سے روانہ ہوئے تھے لیکن پھر بھی بعض لڑکوں نے گاندھی جی کو پہچان لیا اور وہ ان کا نام لے کر چلّانے لگے۔ اس حرکت سے اور بھی بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ذرا سی دیر میں سینکڑوں ہزار وں آدمیوں نے گاندھی جی کو راستہ میں گھیر لیا اور جب مسٹر لاٹن نے مزاحمت کی تو مجمع نے ان کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی علیحدہ کر دیا۔ اور گاندھی جی پر بُری طرح پل پڑے۔ گھونسے مکے اور لاتوں سے گاندھی جی کو ادھ موا کر ڈالا۔ اور اس کے بعد اینٹ پتھر برسانا شروع کر دئے۔ ایک شخص نے گاندھی جی کے سر سے پگڑی اتار کر اس کی توہین کی۔

یہ اتنا خطرناک وقت تھا کہ اگر چند منٹ اور امداد نہ پہونچتی تو گاندھی جی یقیناً ان درندوں کے ہاتھوں ختم ہو جاتے۔

انگریز عورت نے بچا لیا

اتفاق کی بات عین اسی وقت ڈربن کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی اُدھر سے گزر رہی تھی اس نے دیکھا کہ ایک ہندوستانی کو چند یورپی بری طرح مار رہے ہیں اور وہ لہولہان ہو کر گرا ہی چاہتا ہے تو اُسے بہت ترس آیا اور وہ مجمع کو چیرتی پھاڑتی ہوئی گاندھی جی کے پاس پہونچی اور اپنی چھتری کھول کر انہیں پناہ میں لے لیا۔ یورپی لوگوں نے ایک انگریز عورت کو پناہ دیتے ہوئے دیکھا تو ان میں سے بعض نے ہاتھ روک لیا اور بعض اس عورت کو علیحدہ ہو جانے کی ہدایت کرنے لگے۔ مگر وہ دلیری اور بہادری کے ساتھ وہیں اڑی رہی۔

عین اسی وقت ایک ہندوستانی لڑکا بھاگا ہوا کوتوالی پہونچا اور اس نے تمام حالات بیان کئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سپاہیوں کی ایک جمعیت فوراً موقع پر بھیجی اور اس طرح گاندھی جی سپاہیوں کی حفاظت میں کوتوالی لائے گئے

اس وقت گاندھی جی اگرچہ مسکرا رہے تھے لیکن جسم میں جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حادثہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ مجمع ابھی مشتعل ہے اس واسطے آپ کو فی الحال کوتوالی میں قیام کرنا چاہیئے مگر گاندھی جی نے جواب دیا کہ اس میں مجمع کی کوئی خطا نہیں ہے۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ میں نے اپنے ملک ہندستان میں ان لوگوں کو بُرا بھلا کہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ غصّہ میں ہیں۔ اگرچہ مجھ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ لیکن ان غریبوں کو کیا معلوم کہ ان کے لیڈروں نے انہیں غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ نے ہر چند چاہا کہ گاندھی جی کوتوالی میں رہیں مگر وہ نہ مانے اور انہوں نے کہا کہ آپ کی اتنی مہربانی کافی ہے کہ آپ مجھے رستم جی کے مکان تک پہونچا دیجئے سپرنٹنڈنٹ مسٹر الگزینڈر نے سپاہیوں کی نگرانی میں مجبوراً گاندھی جی کو ان کی قیام گاہ تک پہونچا دیا۔ اور احتیاط کے خیال سے پولیس کے چند آدمی مکان کی حفاظت کے لئے بھی تعینات کر دئے۔

مکان پر پہونچکر گاندھی جی کے زخموں کی مرہم پٹی ہوئی۔ اس عرصہ میں جب مجمع کو یہ معلوم ہوا کہ گاندھی جی رستم جی کے مکان میں پہونچ گئے ہیں تو وہ پھر مشتعل ہو گیا اور ایک بڑے مجمع نے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھتے دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ پولیس پھر موقع پر پہونچا اور اس نے گاندھی جی کو بہت کچھ سمجھایا اور کہا کہ اگر آپ اپنی ضد پر اڑے رہے تو مجمع یقیناً اس مکان پر حملہ کر دے گا۔ اور آپ سب کو نقصان پہونچ جائے گا۔ اس کے خلاف اگر آپ فی الحال اس مکان سے علیحدہ ہو جائیں تو باقی لوگ اس مکان میں محفوظ رہیں گے۔

گاندھی جی نے خطرہ کی اہمیت کو سمجھ کر منظور کر لیا۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ مشتعل مجمع باہر موجود ہے اور وہ گاندھی جی کو جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ ایسی حالت

میں کیونکر باہر نکلا جائے۔ خوب غور کرنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ ترکیب بتائی کہ گاندھی جی کسی ہندوستانی سپاہی کی وردی پہن لیں اور اس طرح مجمع کو دھوکا دیکر باہر نکل جائیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس مشورے پر عمل کیا اور ایک ہندوستانی کانسٹبل کی وردی پہن کر اور سر پر ایک دھات کی طشتری رکھ کر اوپر سے وردی کا صافہ لپیٹ لیا۔ تاکہ اگر مجمع انہیں پہنچان لے اور اتفاقاً کوئی حملہ کردے تو سر پر بچاؤ رہے۔ اور اس طرح گاندھی جی دو آدمیوں کے ساتھ مکان سے باہر نکلے اور مجمع کو چیرتے پھاڑتے قریب کے ایک مکان سے ہوکر دوسری طرف کو نکل گئے اور وہاں سے ایک گاڑی میں بیٹھکر سیدھے کوتوالی پہونچ گئے۔

سپرنٹنڈنٹ کی چالاکی

اس موقع پر مسٹر الگزینڈر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی چالاکی کا بیان بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ دیر تک مجمع کو قابو میں رکھا اور مکان پر حملہ نہ ہونے دیا۔

مکان کے اندر گاندھی جی بھیس بدل رہے تھے اور دروازہ کے باہر ایک طرف کو کھڑے ہوکر سپرنٹنڈنٹ پولیس مجمع کو مخاطب کرکے تقریر کر رہے تھے۔ اس تقریر کا مقصد یہ تھا کہ گاندھی کو فلاں جگہ پھانسی دی جائے گی۔ وہ بہت خراب آدمی ہے۔

یہ گفتگو چونکہ مجمع کے مطلب کی تھی اس واسطے سارا مجمع اس کی طرف متوجہ تھا ادھر گاندھی جی بغیر کسی روک ٹوک کے پولیس کے سپاہی کا بھیس بناکر باہر نکل گئے اور مجمع کو خبر بھی نہ ہوئی کہ جس شکار کی تلاش میں وہ ہے۔ وہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

اور جب سپرنٹنڈنٹ کو یہ یقین ہوگیا کہ گاندھی جی بحفاظت تمام اس خطرہ سے نکل گئے تو اس نے مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ بھائیو ہم چاہتے ہیں کہ ہر مفسد کو پھانسی دیدی جائے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگ جس شکار کی تلاش میں یہاں آئے ہیں وہ اس مکان سے فرار ہوچکا ہے۔ اس واسطے ہم مجبور ہیں۔ اس پر مجمع کو یقین نہیں آیا تو

سپرنٹنڈنٹ نے مجمع میں سے دو چار با اثر آدمیوں کو ساتھ لے کر رستم جی کے مکان کی تلاشی لی۔ اور جب مجمع کے نمائندوں کو گاندہی جی مکان میں نہ ملے تب انہوں نے بہی آکر اس کی تصدیق کر دی۔

اس عجیب چالاکی کی بدولت گاندہی جی کی جان بچ گئی اور مجمع بہی منتشر ہوگیا۔ مگر گاندہی جی کے خلاف تمام شہر میں ایک بے چینی پیدا ہوگئی۔ وہاں کے مقیم ہندوستانی اگرچہ کافی تعداد میں تھے مگر یورپی باشندوں کی طرح نہ ان کے پاس طاقت تھی نہ دولت۔ نہ تعلیم تھی نہ سیاست اور انہی کمزوریوں کے باعث وہ یورپی باشندوں سے دبتے تھے۔

دشمنوں کو ندامت

گاندہی جی کئی روز تک پولیس کی نگرانی میں رہے۔ اس عرصہ میں حادثہ کی اطلاع دور دور تک پہونچ گئی۔ اس زمانہ میں آنجہانی مسٹر چیمبرلین نوآبادیات کے وزیر تھے انہوں نے یہ حالات سنکر ناٹال کی حکومت کو تار دیا کہ مفسدوں پر مقدمہ چلایا جائے اور جو لوگ مجرم ثابت ہوں۔ انہیں سزا دیجائے۔ ادہر مقامی اخبارات کے نمائندے گاندہی جی سے ملے۔ مگر گاندہی جی نے کہا کہ میں فساد کرنے والوں پر مقدمہ نہیں چلاؤں گا۔ وہ لوگ بے قصور ہیں۔ اگر ان کے لیڈر اور ان کی حکومت چاہتی تو یہ جھگڑا ہرگز نہ بڑہتا۔ اس واسطے میں بے گناہوں پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ گاندہی جی نے مقامی اخبارات کے نمائندوں کو چند تحریری ثبوت دیکر ثابت کیا کہ ہندوستان میں یورپی لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ان لوگوں کو غلط خبروں نے بھڑکا دیا ہے۔ اس کے بعد گاندہی جی کا ایک بیان بھی مقامی اخبارات میں چھپا جس میں انہوں نے اعلان کیا تھا کہ باوجود وزیر نوآبادیات کی اجازت کے وہ کسی یورپی کو سزا دلانا نہیں چاہتے اور نہ وہ اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو قصوروار سمجھتے ہیں۔

اس بیان سے یورپی باشندے بہت نادم ہوئے اور گاندہی جی کی نیک

شخصیت کا ان پر اثر ہوا۔ اور ان کے خلاف جو جو شکایتیں تھیں اس بیان سے دور ہوگئیں۔ گاندھی جی نے اس سے بھی آگے نیکی کا ایک قدم اور بڑھایا اور وزیر نوآبادیات کے نام اپنی تحریر بھیجدی جس میں بتایا گیا تھا کہ وہ یورپی لوگوں کو معاف کر چکے ہیں اور اب کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔

اس واقعہ کی شہرت نے گاندھی جی کی عظمت میں چار چاند لگا دیے اور اس کے بعد ڈربن میں عام ہندوستانیوں کو کسی قدر اچھی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہاں کے باشندوں کو ہندوستانیوں کے مقابلہ کی طاقت اور خاموش انتقام کی قوت کا احساس بھی ہوگیا جس کی بدولت وہ لوگ ہندوستانیوں کو خطرناک بھی سمجھنے لگے۔

ناٹال کانگریس کی مضبوطی

اس کشمکش نے سب پر ثابت کردیا کہ جنوبی افریقہ میں ابھی ہندوستانی طاقت کو بڑھانے کی ضرورت ہے اس لئے گاندھی جی نے واقعات سے سکون ملتے ہی سب سے پہلے ناٹال انڈین کانگریس کو اور زیادہ مضبوط اور باا ثر جماعت بنایا۔ اس کے لئے سرمایہ اور مستقل آمدنی کے ذرائع پیدا کرنے کا انتظام کیا تاکہ وقت پر کمزوریوں سے نقصان نہ پہونچے۔ گاندھی جی کی ان تھک کوششوں سے یہ مختصر سی جماعت تھوڑے ہی دن میں خوب مضبوط ہو گئی۔ اور سرمایہ بھی اچھا خاصہ جمع ہوگیا۔

اب کی مرتبہ گاندھی جی اپنی بیوی اور دو بچوں کے علاوہ اپنے یتیم بھانجہ کو بھی تعلیمی غرض سے ساتھ ہی لائے تھے اور یہ مختصر سا خاندان چند ہنگامی اور وقتی تکالیف اٹھاکر ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک بہت سکون سے رہتا رہا۔ اس مختصر سے عرصہ میں اگرچہ کوئی سیاسی معرکہ نہیں ہوا لیکن گاندھی جی کی چند ذاتی باتیں یقیناً تاریخی

حیثیت رکھتی ہیں۔ اور اگر کوئی اُن سے سبق لینا چاہے تو ایک حد تک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

اسپتال میں کمپونڈر

خاموش زندگی کبھی بھی گاندھی جی کو نہیں بھائی۔ چنانچہ بیٹھے بیٹھے انہوں نے سوچا کہ وکالت سے جتنا وقت بچتا ہو اُسے خدمت قوم میں صرف کرنا چاہیئے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ایسا کونسا کام ہو جس پر زیادہ وقت نہ لگے اور یہ شوق پورا ہو جائے۔ سوچتے سوچتے گاندھی جی نے ایک مقامی اسپتال میں تیمارداری کے فرائض بہتر سمجھ کر اسی خدمت کا انتخاب کر لیا اور دو گھنٹے اس کام کے لئے وقف کر دئے۔ اس اسپتال میں گاندھی جی نے کمپونڈری کا کام بھی سیکھ لیا اور تیمارداری کے علاوہ دوا سازی میں بھی وہاں کے کارکنوں کو امداد دینے لگے۔ اس خدمت سے اُن کا دل بہت مسرور تھا اور وہ بڑی خوشی سے روزانہ اسپتال جانے لگے۔

دھوبی کا کام

اسی زمانہ میں گاندھی جی پر کفایت شعاری کا جذبہ سوار ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ قومی نمائندے کی حیثیت سے انہیں اپنا لباس خاص طور پر فیشن ایبل رکھنا پڑتا تھا دوسرے تیسرے دن کپڑے تبدیل کرتے تھے اور کالر تو روز ہی بدل دیا جاتا تھا۔ مگر اس فیشن پرستی نے دھوبی کا خرچ بہت بڑھا دیا۔ جس کی وجہ سے گاندھی جی اپنے اس اصول کو قائم رکھنے میں مشکلات کا سامنا کرنے لگے۔

ایک دن سوچا کہ اگر کالر خود ہی روزانہ دھو لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔ اس سے بھی کچھ نہ کچھ بچت ہوگی۔ چنانچہ آپ نے بڑی امنگ کے ساتھ کالر کو دھویا اور اس میں اتنی بہت سی پیچ (مانڈی) تھوپ دی کہ وہ لکڑی کی طرح سخت ہی نہیں ہوگیا بلکہ بہت ہی بھدا اور کھردرا بھی بن گیا۔ اور جب یہ کالر لگا کر گاندھی جی عدالت میں پہنچے تو بہت سے بیرسٹر دوستوں نے خوب مذاق اڑایا۔ طرح طرح کے آوازے کسے مگر انہوں نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا کہ کفایت شعاری ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔

نائی کا کام اسی طرح ایک دفعہ گاندھی جی ایک گورے نائی کی دوکان پر حجامت کرانے کی غرض سے پہونچے تو اس نے کالا آدمی سمجھ کر انہیں واپس کر دیا اور ان کی حجامت بنانے سے تحقیر کے ساتھ انکار کیا۔ گاندھی جی نے اس ذلت کو بری طرح محسوس کیا اور اس کے ساتھ ہی خود بال بنانے اور کاٹنے کا ارادہ کر کے بال کاٹنے کی ایک مشین اور دوسرے ضروری سامان خرید لئے۔

ظاہر ہے کہ انسان خود اپنے بال نہیں کاٹ سکتا۔ اور پھر سر کے پچھلے بال تو خود کاٹنے ناممکن ہیں مگر انہوں نے کوشش کر کے پوری حجامت بنائی۔ دوستوں نے ان کی اس دلچسپ حالت کا بھی خوب مذاق بنایا۔ مگر جب گاندھی جی سے اس کی اصل وجہ معلوم کی تو نادم ہو گئے۔

بے تعصبی

گاندھی جی اگرچہ کٹر ہندو اور اپنے مذہب کے پوری طرح پابند ہیں مگر ان میں تعصب کا مادہ کبھی پیدا نہیں ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں گاندھی جی کا طرز زندگی بہت سادہ تھا۔ ان کے تین چار محرر بھی ان کے ساتھ ہی مکان میں علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے تھے۔ یہ مکان نئی طرز کا تھا۔ ہر کمرہ میں رفع حاجت کے لئے "پاٹ" رکھا رہتا تھا۔ چونکہ گاندھی جی مساوات کے خیال سے یہ غلاظت مہتروں کے ذریعہ صاف نہیں کراتے تھے۔ اس واسطے یہ خدمت بھی خود گاندھی جی اور ان کی بیوی کو انجام دینا پڑتی تھی۔

بیوی سے لڑائی درحقیقت کستورا بائی کی نیکی اور سادگی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی انہوں نے محرروں کے کمروں سے غلاظت اٹھانے پر کبھی عذر نہیں کیا۔ مگر ایک دفعہ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ ہی گیا۔ گاندھی جی نے

ایک نیا محرر رکھا یہ شخص نیچ ذات کا تھا مگر اب عیسائی ہو گیا تھا۔ کستورا بائی کو اس کی غلاظت اٹھانے اور پاٹ صاف کرنے میں کراہت محسوس ہوئی اور انہوں نے گاندھی جی سے اس کی شکایت کی۔ گاندھی جی پر اس زمانہ میں مساوات کے ساتھ ہی شوہرانہ غرور کا بھی دورہ تھا۔ انہیں بیوی کی یہ بات پسند نہ آئی اور بہت سخت سست الفاظ میں غریب کستورا بائی کو ڈانٹ دیا۔ بہتر ہوگا کہ یہ پورا واقعہ گاندھی جی کے الفاظ میں سن لیجیے۔

"دوسروں کے پاٹ صاف کرنے میں میری بیوی نے کبھی عذر نہیں کیا مگر جو شخص پنچم سے عیسائی ہوا تھا۔ اُس کا میلا اٹھانا انہیں کسی طرح گوارا نہیں ہوا۔ اس بات پر ہم دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ اُن سے نہ تو یہ دیکھا جاتا تھا کہ میں اُس شخص کا پاٹ اٹھاؤں اور نہ وہ خود اٹھانا پسند کرتی تھیں۔ میری آنکھوں میں آج تک وہ تصویر پھرتی ہے کہ وہ پاٹ ہاتھ میں لئے سیڑھی سے اتر رہی ہیں۔ آنکھیں غصہ سے لال ہیں۔ رخساروں پر آنسو بہہ رہے ہیں اور مجھے بُرا بھلا کہہ رہی ہیں۔"

اس منظر کو دیکھ کر گاندھی جی کا پارہ بہت تیز ہو گیا۔ انہیں بیوی کا یہ تعصب ناگوار گزرا۔ وہ چاہتے تھے کہ کستورا بائی اُن کے ہر حکم کو (خواہ وہ ظالمانہ ہی کیوں نہ ہو) بہت خوشی کے ساتھ سن کر تعمیل کریں۔ کستورا بائی نے حتی المقدور ان کی اس خواہش کا بہت احترام کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس پارسا خاتون نے مشرقی تہذیب کی ایک قابل تقلید مثال پیش کی مگر گاندھی جی نے وقت پر ان کی فرمانبرداری کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بری طرح ڈانٹا اور کہا کہ مجھے اپنے گھر میں یہ بیہودگی پسند نہیں۔

غریب عورت آخر انسان ہی تھی اُسے بھی کچھ غصہ آگیا۔ جھلّا کر بولی۔ تمہیں اپنا گھر مبارک ہو مگر میرا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔ بیوی کے اس جواب کو سنکر گاندھی جی نے کیا کہا یہ بات بھی گاندھی جی کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"میں یہ سنکر اپنے آپے میں نہ رہا اور میرے دل میں رحم کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ میں اُن بے چاری کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا سیڑھی کے سامنے پھاٹک پر لے گیا اور دروازہ کھولنے لگا کہ انہیں باہر دھکیل دوں وہ زار و قطار روتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ آدمیت سے گزرے جاتے ہو۔ آخر میں جاؤں کہاں۔ یہاں نہ میرے ماں باپ ہیں نہ بھائی بند ہیں جو میرے سر پر ہاتھ رکھیں میں تمہاری بیوی ہوں۔ اس لئے تم چاہتے ہو کہ میں ٹھوکریں کھاؤں اور اُف نہ کروں۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ دروازہ بند کرو۔ لوگ ہمیں اس حالت میں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔"

جب گاندھی جی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہیں اپنی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا مگر اس ندامت کا اظہار انہوں نے بیوی کے سامنے نہیں کیا۔

بوئروں کی جنگ

۱۸۹۹ء میں جنوبی افریقہ کے بوئروں اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس موقع کو مسٹر گاندھی نے بہت غنیمت سمجھا کیونکہ یہی وقت انگریزوں کو ہندوستانی باشندوں کا وزن معلوم کرانے کے لئے موزوں تھا۔

گاندھی جی نے فوراً ہی ایک ہندوستانی کمیٹی کو جنگ کی خدمات کے لئے منظور کرا لیا۔ اور سینکڑوں ہزاروں ہندوستانیوں نے اپنی جانیں خطرے

میں ڈوال کر انگریزوں کی مدد کی اور ان کے زخمیوں کو فوری طبی امداد دیکر ثابت کر دیا کہ وہ ہندوستانی جنہیں ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا تھا کتنے محسن اور اپنے دشمنوں کو کتنی جلدی معاف کرنے والے ہیں۔

منتظمین نے اس خدمت کو بہت سراہا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ امن ہو جانے کے بعد ہندوستانیوں کی خدمات کو جدید گورنمنٹ نہیں بھولے گی اور اب یقیناً ان کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر انجام دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی نئی حکومت پہلے انتظام سے بھی زیادہ بے بصیرت نکلی۔ اور اس نے ضرورت سے زیادہ گہری سیاسی چالیں شروع کر دیں۔ ایک نیا محکمہ قائم کر کے جدید گورنمنٹ نے انتہائی تعصب اور امتیاز نسل کا ثبوت دیا۔ اس محکمہ کا مقصد یہ تھا کہ آئندہ جو ہندوستانی جنوبی افریقہ میں رہنا چاہیں وہ اپنا نام درج رجسٹر کرائیں۔ اور اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اس جرم کی سزا ملے گی۔

حکومت سے ٹکر

ہندوستانیوں کو یہ توہین بہت ناگوار گزری۔ وہ احسان کا بدلہ دیکھنا چاہتے تھے اور جب امید کے خلاف وہی سابقہ رنگ دیکھا تو ان کا خون کھول اٹھا۔ گاندھی جی بھی اس طرز عمل سے حیران تھے آخر کار سب نے مل کر طے کر لیا کہ خواہ کتنی ہی مشکلات پیش آئیں۔ مگر اس توہین کو گوارا نہیں کریں گے اور اس عہد پر اتنی سختی کے ساتھ عمل کیا کہ ناٹال کی جیلیں ہندوستانیوں سے بھر گئیں۔

ان دنوں ہندوستانیوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ ان کی عورتیں اور بچے بڑھ بڑھ کر اپنے مردوں کو دلیری اور ہمت کا سبق دے رہے تھے اور یہ آزادی کے دیوانے خوشی خوشی ہر تکلیف اور مصیبت کو کھیل سمجھ کر برداشت کر رہے تھے۔

فتح

یہ حال دیکھ کر حکومت کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے مسٹر گاندھی سے وعدہ کر لیا کہ فی الحال یہ قانون ملتوی کر دیا جائے گا۔ اور ہندوستانی باشندوں کو محض یہ مشورہ دیا جائے گا کہ جو لوگ خوشی سے چاہیں اپنا نام درج کرالیں۔ اس بات پر گاندھی جی راضی ہو گئے۔ اور ہندوستانیوں کے اخلاق کا بہترین نمونہ پیش کرنے کے لئے پہلے خود ہی نام لکھانے کا ارادہ کر کے دفتر کی طرف چلے۔

پٹھان نے مارا

راستہ میں کسی خان بھائی کو پتہ چل گیا کہ گاندھی جی حکومت سے مل گئے ہیں۔ وہ یہ سن کر بے تاب ہو گیا کہ ہزارہا ہندوستانیوں کو جیل میں ٹھونس کر گاندھی نے دغا دی اور خود حکومت کی خوشامد کرنے جا رہے ہیں۔ پٹھان کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اس نے راستہ میں ہی گاندھی جی کو پکڑ کر بری طرح مارا۔ گاندھی جی نے بہت صبر کے ساتھ اسے برداشت کیا۔ اور جب بعض واقف کاروں نے گاندھی جی کو پٹھان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لئے ابھارنا چاہا تو گاندھی جی نے یہ کہہ کر سب کو مطمئن کر دیا کہ اُس نے اس غلط فہمی میں مجھے یہ سزا دی ہے کہ میں خوشامد کرنے جا رہا تھا۔ اگر وہ صحیح حالات جانتا تو یقیناً وہ مجھ سے کچھ نہ کہتا۔ اس واسطے میں اُسے معاف کر چکا ہوں۔

پھر وہی آفت

حکومت کے وعدوں پر یقین کر کے ہندوستانیوں نے اپنی جدوجہد بند کر دی تھی۔ مگر کسے خبر تھی کہ حکومت کے یہ وعدے محض دفع الوقتی کے لئے تھے اور وقت گزر جانے کے بعد پھر وہی تکالیف سامنے آگئیں۔ طرح طرح کے ذلیل قانون بننے لگے۔ اور ہندوستانیوں پر وہی مصائب پھر نازل ہو گئیں۔

پھر جدوجہد

یہ حال دیکھ کر نائٹال انڈین کانگریس نے پھر جدوجہد شروع کر دی اور اب کے اس وقت تک باز نہ آئی جب تک کہ حکومت نے پوری

طرح مطالبے منظور کرنے کا پکّا وعدہ نہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں ہندوستانیوں نے کیسی کیسی زبردست قربانیاں دیں ان کا حال لکھنے کیلیئے یقیناً پورا دفتر چاہیئے۔ بچہ بچہ کے دل میں ہم وطنوں کی محبت کا سمندر جوش مار رہا تھا اور اسی بے مثال خلوص کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کی قربانیاں رنگ لائیں اور جلد سے جلد ان کی مشکلات کا خاتمہ ہوگیا۔

اطمینان

حکومت نے بیشتر مطالبے منظور کرلیئے اور ان پر عملدرآمد ہوگیا۔ رفتہ رفتہ تمام حالات پر سکون ہوگئے۔ بظاہر گاندھی جی اپنا کام ختم کرچکے تھے اور اب انکے سامنے سوائے قوم کی معمولی ضروریات کے اور کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لئے وہ جنوبی افریقہ میں رہنے کے واسطے مجبور ہوں۔

واپسی کا ارادہ چنانچہ گاندھی جی نے اپنے دوستوں سے واپسی کی اجازت طلب کی ادہر ہندوستان کے احباب بھی اُن کی واپسی کا اصرار کر رہے تھے دوستوں نے گاندھی جی کو ان کے حالات سنکر بادل ناخواستہ واپسی کی اجازت دیدی اگرچہ ان میں سے ایک بھی گاندھی جی سے علیحدہ ہونا نہ چاہتا تھا مگر اُن کے اصرار نے سب کو خاموش کردیا۔ گاندھی جی نے یہ بھی بتایا کہ انہیں ہندوستان پہونچکر بھی افریقہ کے لئے کچھ کام[۱] کرنا ہے

واپسی کے تحفے گاندھی جی کی واپسی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں کے لئے کچھ معمولی بات نہ تھی۔ وہ گاندھی جی کی بے لوث قربانیاں دیکھ چکے

---

[۱] اسی زمانہ میں ایک قانون جنوبی افریقہ کے لئے منظور ہونے والا تھا اور اُسے وہاں کے ہندوستانی باشندے پسند نہ کرتے تھے۔ مگر اس میں گورنمنٹ ہند کی مداخلت کے علاوہ اور کسی کوشش سے کام نہ چل سکتا تھا۔ اس واسطے گاندھی جی کا ہندوستان آنا اور بھی مفید تھا۔

تھے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ گاندھی جی یوں ہی چپ چاپ افریقہ سے روانہ ہو جائیں۔ وہاں کے احباب اور عقیدتمندوں نے بڑی بڑی شاندار دعوتیں کیں اور اپنی بساط کے مطابق پوری طرح عقیدت کا اظہار کیا۔ سینکڑوں قسم کے تحائف گاندھی جی اور ان کے بیوی بچوں کو دئے گئے۔ یہاں تک کہ گاندھی جی کے پاس تحائف کا ایک انبار لگ گیا اس میں ہر قسم کی چیزوں کے علاوہ قیمتی زیورات بھی تھے۔ جنہیں دیکھ کر گاندھی جی کی بیوی بہت خوش ہوئیں۔

قوم کا پیسہ گاندھی جی نے اگرچہ یہ تمام تحفے خوشی خوشی قبول کر کے عقیدتمندوں کے جذبات کا پوری طرح احترام کیا مگر ان کا دل ان تحائف کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب کچھ قومی خدمات کا صلہ ہے اور اسی وجہ سے دئے گئے ہیں۔ اور چونکہ قومی خدمات کا معاوضہ وہ کسی حالت میں بھی لینے کے لئے تیار نہ تھے اس واسطے انہوں نے خوب غور و خوض کے بعد یہ رائے قائم کی کہ قوم کا پیسہ اگر قومی ضروریات میں ہی صرف کیا جائے تو بہت مناسب ہے، چنانچہ انہوں نے یہ خیال اپنے بیوی بچوں سے بھی ظاہر کیا۔

بیوی کی ضد اس ہمدردانہ خیال سے بچے متفق ہو گئے اور انہوں نے بڑی مسرت کے ساتھ اپنے تمام تحفے قوم کے نام پر واپس کرنے کا ارادہ کر لیا مگر عورتیں ان معاملات میں کسی قدر ضدی ہوتی ہیں۔ گاندھی جی کی بیوی نے جو یہ سنا کہ گاندھی جی ان تحائف کے ساتھ ہی زیور بھی واپس کر دیں گے تو انہیں ناگوار ہوا اور اس سلسلہ میں میاں بیوی میں ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی۔ گاندھی جی کہتے تھے کہ تم خود زیور نہیں پہنتی ہو تو تمہیں زیور رکھنے سے کیا فائدہ ہوگا اس کے جواب میں کستورا بائی کہتی تھیں کہ اگر میں زیور نہیں پہنتی یا مجھے اس کا شوق نہیں ہے تو کیا ہوا۔ کل کو بچوں کی شادیاں ہوں گی۔ بہوویں آئیں گی وہ تو پہنیں گی۔ اس

کستورا بائی
گاندھی جی کی وفادار بیوی جس نے ہر دکھ درد میں گاندھی جی
کا ساتھ دیکر ہندوستانی عورتوں کے لئے قابل تقلید مثال پیش کی

پر گاندھی جی نے کہا کہ ہم اپنے لڑکوں کی شادیاں ہی ایسی جگہ کریں گے جہاں زیور کا شوق نہ ہو۔ اور اگر انہیں زیور کا شوق ہوا بھی تو مجھ سے کہنا بنوا دوں گا۔

یہ جواب سنکر کستورا بائی کو غصہ آیا اور وہ کچھ مایوسانہ انداز میں بولیں

" اور کیا۔ تمہیں سے تو کہوں گی۔ میں نے تمہیں اتنے دن میں خوب دیکھ لیا۔ تم نے میرے پیچھے پڑکر سارا زیور لے لیا ہو ؤں کے لئے تم ضرور زیور خرید دوگے۔ بچوں کو تو تم ابھی سے سادھو بنانے کی فکر میں ہو۔ نہیں صاحب۔ میں یہ زیور واپس نہیں ہونے دونگی اور یہ تو کہو کہ میرا کنٹھا واپس کرنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

اور جب گاندھی جی نے نرمی سے یہ کہا کہ یہ تمام چیزیں میری قومی خدمات کے صلہ میں آئی ہیں۔ اس واسطے میں ان کو واپس کرنے کا حق رکھتا ہوں تو ان کی بیوی اور بھی جھلا گئیں۔ بولیں۔

" یہ سچ ہے مگر وہ تمہاری خدمت ہوئی یا میری خدمت بات ایک ہی ہے۔ میں نے جو تمہارے کام کی خاطر دن رات مشقت اٹھائی وہ کسی گنتی ہی میں نہیں۔ تم نے دنیا بھر کے مردوے میرے گھر میں لاکر بھر دیئے مجھے آٹھ آٹھ آنسو رلایا اور مجھے ان کی مرہم پٹی کرنا پڑی۔"

یہ بحث اتنی دلچسپ اور اتنی عجیب و غریب تھی کہ گاندھی جی کو اس سلسلہ میں بہت کافی کوشش کرنا پڑی۔ خدا خدا کرکے کستورا بائی راضی ہوئیں اور گاندھی جی نے اپنے احباب سے ایک موقع پر تذکرہ کرکے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ انہوں نے کہا چونکہ یہ تمام تحائف قومی خدمات کے عوض مجھے ملے ہیں اور میں یہ معاوضہ قبول کرنے سے معذور ہوں اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ یہ تمام چیزیں قوم کی ملکیت قرار دیکر

ان کا ایک وقف نامہ مرتب کر دوں۔

احباب نے مجبور ہو کر گاندھی جی کی یہ رائے منظور کر لی اور گاندھی جی نے گزشتہ چار سال کے تمام تحائف کی ایک فہرست مرتب کر کے وقف نامہ تیار کر دیا۔ اور تمام انتظامات مکمل کرنے کے بعد یہ ہزارہا روپے کے قیمتی تحائف ایک بنک میں قوم کے نام پر جمع کر دئے گئے جو آج تک وہاں محفوظ ہیں اور جن کا منافع بڑھتے بڑھتے معقول رقم ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب بھی وہاں کے قومی کاموں میں اس رقم سے امداد لیجاتی ہے۔

پھر ہندوستان میں

ان تمام مراحل سے فارغ ہو کر گاندھی جی سن ۱۹۰۱ء میں ہندوستان واپس آ گئے۔ چلتے وقت وہاں کے قومی کام کرنے والوں نے گاندھی جی سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر انہیں فوراً افریقہ واپس آنا پڑیگا۔ گاندھی جی نے قومی ضروریات سے مجبور ہو کر وعدہ کر لیا تھا کہ جب کبھی ضرورت ہو گی۔ وہ افریقہ آ جائیں گے۔

کانگریس میں گاندھی جی جس وقت ہندوستان پہونچے تو یہ وہ زمانہ تھا جب یہاں کی کانگریس (انڈین نیشنل کانگریس) کا اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ اُس وقت کانگریس کا صرف اتنا ہی کام تھا کہ سال بھر میں ایک مرتبہ کسی نہ کسی جگہ اس کا اجلاس ہوا کرتا تھا اور باقی تمام سال یہ جماعت گہری نیند سویا کرتی تھی۔ اگرچہ کانگریس کے سامنے اس زمانہ میں بہت سے کام نہ تھے پھر بھی اجلاس کے زمانہ میں اس کے کارکن بہت مصروف نظر آیا کرتے تھے گاندھی جی نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ ان کے خیال میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی امداد کا یہ بہترین موقع تھا۔ اور ایسے اجلاس میں افریقی ہندوستانیوں کے لئے کسی ریزولیشن

کا منظور ہو جانا بہت کارآمد تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کانگریس میں گاندھی جی کو اچھی طرح کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اس کے علاوہ اپنے ہی ملک کی ضروریات کیا کم تھیں کہ کانگریس سمندر پار کے لوگوں کا خیال کرتی۔

بہر حال گاندھی جی مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے سنا کہ سر فیروز شاہ مہتا کانگریس کے اجلاس میں شریک ہونے کیلئے بمبئی سے کلکتہ جارہے ہیں۔ یہ صاحب گاندھی جی سے پہلے بھی مل چکے تھے۔ اور انہیں معلوم تھا کہ گاندھی جی افریقہ کے ہندوستانیوں کی اچھی خدمت کر رہے ہیں۔ جب گاندھی جی ان سے ملے اور کانگریس کے اجلاس میں افریقہ کے لئے ریزولیوشن پاس کرانے کی درخواست کی تو سرمہتہ نے لاپروائی کے ساتھ وعدہ کر لیا۔ گاندھی جی انہی کے ساتھ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

کلکتہ پہونچ کر معلوم ہوا کہ اجلاس شروع ہونے میں ابھی تین چار روز کی دیر ہے۔ اس عرصہ میں گاندھی جی وہاں کے دوسرے کانگریسی لیڈروں سے ملے کانگریس کے دفتر میں بھی گئے اور وہاں اس کے سکریٹری وغیرہ سے راہ و رسم پیدا کی۔ اس زمانہ میں گھوشال بابو کانگریس کے سکریٹری تھے۔ وہ گاندھی جی کے خیالات معلوم کر کے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے ہندوستانی کاموں میں بھی گاندھی جی سے تحریری مدد لی۔ اس عرصہ میں گاندھی جی کی ملاقات بہت سے کانگریسی لیڈروں سے ہو گئی۔ گاندھی جی نے بھی اس موقع سے کافی فائدہ اٹھایا اور سب کے سامنے افریقہ کے بدنصیبوں کی رام کہانی بیان کی۔ سب نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے اجلاس میں ریزولیوشن پاس کرانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ایک اجلاس میں سرمہتہ کے اشارہ سے گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی مشکلات پر ایک مختصر سی تقریر کرتے ہوئے ریزولیوشن پیش کیا جو معمولی بحث کے بعد منظور کر لیا

گیا۔ گاندھی جی کو اس کامیابی سے بہت مسرت ہوئی۔ اس معاملہ میں مسٹر گوکھلے نے بھی گاندھی جی کی کافی مدد کی۔ اجلاس کے بعد بھی گاندھی جی کو مسٹر گوکھلے سے بہت مدد ملی۔ کیونکہ یہ مسٹر گوکھلے کے اصرار پر انہی کے ہاں مقیم ہو گئے۔ اور ایک مہینہ تک ان کے ساتھ رہے۔ گوکھلے نے اس ایک ماہ کے عرصہ میں گاندھی جی کو بڑے بڑے آدمیوں سے ملایا اور اس طرح گاندھی جی کو اپنے مشن کی کامیابی میں بہت مدد دی۔

اسی دوران میں انہوں نے برما کا سفر بھی کیا اور وہاں بھی کانگریسی لیڈروں سے مل کر تائید حاصل کی۔ اور اس کے بعد کلکتہ کچھ دن ٹھہر کر راجکوٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

یہ سفر گاندھی جی نے تھرڈ کلاس میں کیا۔ اور انہیں پہلی بار اس درجہ کے مسافروں کی تکلیف کا احساس ہوا۔ راستہ میں بنارس آگرہ جے پور اور پالن پور ٹھہرتے ہوئے راجکوٹ پہونچ گئے۔

پھر وکالت

راجکوٹ پہونچکر گاندھی جی نے پھر وکالت شروع کر دی۔ اس مرتبہ ان کی وکالت خوب چل نکلی لیکن دوست احباب نے کہا کہ بمبئی میں ترقی کا میدان زیادہ وسیع ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس مشورہ پر عمل کیا اور بمبئی پہونچکر کام شروع کر دیا۔ جنوبی افریقہ کی شہرت کی بدولت یہاں بھی ان کا کام خوب چل نکلا۔ اس زمانہ میں مسٹر گوکھلے بھی قومی کاموں میں سرگرم حصہ لیتے تھے اور گاندھی جی کو اکثر بڑے لوگوں سے ملایا کرتے تھے۔

پھر افریقہ چلے

مسٹر گوکھلے کی صحبت میں گاندھی جی کو ہندوستانی کانگریس میں خاصی دلچسپی ہو گئی تھی اور ان کا کاروبار بھی خوب چل نکلا تھا اسی زمانہ میں نبیب ناٹال انڈین

کانگریس کا تار پہونچا۔ کہ ڈربن میں مسٹر چیمبرلین کے آنے کی خبر ہے فوراً پہونچو۔ گاندھی جی نے وعدہ کے مطابق اطلاع دیدی اور کرایہ طلب کیا چنانچہ فوراً ہی بذریعہ تار روپیہ پہونچ گیا اور وہ پہلے جہاز سے ڈربن کے لئے روانہ ہوگئے۔

وفد کی ناکامی ڈربن پہونچکر گاندھی جی نے مسٹر چیمبرلین کے پاس لے جانے کے لئے ایک وفد مرتب کیا۔ چیمبرلین نے وفد کے ساتھ خوش خلاقی کا اظہار کرتے ہوئے مطالبات پر غور کرنے کا وعدہ کرلیا۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وعدہ وقع الوقتی کیلئے تھا۔ اس سے گاندھی جی کو بہت مایوسی ہوئی۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں کے طعنے بھی سُنے جنہوں نے گاندھی جی کی حکومت پرستی پر خوب لعن طعن کی۔

حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے گاندھی جی نے ٹرانسوال میں مستقل سکونت کا ارادہ کرلیا۔ اور قومی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہیں وکالت شروع کردی۔ اس مرتبہ گاندھی جی میں ایک نئی بات پیدا ہوگئی۔ یعنی اپنی آمدنی کا تمام حصہ انہوں نے اپنا معمولی خرچ بچاکر قومی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنی شاندار زندگی کو بھی ختم کرکے ہر معاملہ میں بے حد سادگی شروع کردی۔

خاندان کی خفگی اس توکل اور سادگی کا اثر گاندھی جی کے بھائی پر بھی پڑا۔ کیونکہ گاندھی جی اپنی آمدنی میں سے ایک مقررہ رقم اپنے بیوی بچوں کے اخراجات کے واسطے بھی بھیجا کرتے تھے مگر اس توکل کی زندگی سے نے اسے بند کردیا۔ اور اب گاندھی جی کے بیوی بچوں کا بار بھی ہندوستان میں گاندھی جی کے بڑے بھائی پر پڑگیا۔

بڑے بھائی نے اس تبدیلی کی وجہ گاندھی جی سے بذریعہ خط و کتابت

دریافت کی تب بھی انہوں نے بڑی آزادی اور صفائی کے ساتھ اپنا ارادہ ظاہر کر دیا اور لکھا کہ قومی ضروریات زیادہ اہم ہیں۔ اس جواب سے گاندھی جی کے بھائی ناراض ہو گئے اور عرصہ تک دونوں طرف سے خط و کتابت بند رہی۔

ناظرین کو یہ بات بتانا یاد نہیں رہی کہ گاندھی جی نے ایک مرتبہ قیام بمبئی کے زمانہ میں ایک امریکن بیمہ کمپنی میں اپنی زندگی کا بیمہ دس ہزار روپے میں کرایا تھا مگر اس توکل کی زندگی کے زمانہ میں افریقہ سے انہوں نے اپنے بھائی کو لکھ دیا کہ بیمہ پالیسی کو ختم کر دیا جائے وہ آئندہ قسطیں نہیں بھیجیں گے۔

نباتاتی مشرب کی تبلیغ

جوہانسبرگ (ٹرانسوال) میں گاندھی جی نے نباتاتی مشرب کی خوب تبلیغ کی۔ اس زمانہ میں شہر جوہانسبرگ میں ایک چھوٹا سا نباتاتی ہوٹل تھا۔ مگر وہ نقصان سے چل رہا تھا۔ گاندھی جی نے اُسے اپنی جیب سے معقول امدادیں دیں۔ مگر وہ نہ چل سکا اور آخر کار بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون نے نباتاتی ہوٹل کھولنے کا ارادہ کیا۔ گاندھی جی کو ان کے ارادہ کا پتہ چل گیا۔ اور انہوں نے ہر قسم کی امداد دینے کا وعدہ کیا خاتون نے گاندھی جی سے بطور امداد پندرہ ہزار روپے طلب کئے۔ کیونکہ ہوٹل پورے اہتمام اور وسیع پیمانہ پر کھولا جا رہا تھا اور اس سے بہت آمدنی کی توقع تھی۔ گاندھی جی کے پاس بھلا اتنی رقم کہاں تھی۔ تاہم وہ اپنے ایک موکل سے ملے جو گاندھی جی کے پاس اپنا تمام سرمایہ بطور امانت رکھتا تھا۔ اس موکل کا بہت کافی روپیہ گاندھی جی کی تحویل میں تھا۔ اور اس نے بڑی خوشی اور اعتبار کے ساتھ اجازت دیدی اس طرح گاندھی جی نے موکل کے روپیہ میں سے پندرہ ہزار روپے اس ہوٹل کی نذر کر دئے۔ مگر مالکہ ہوٹل کی ناتجربہ کاری کے باعث تمام روپیہ تباہ ہو گیا اور یہ ہوٹل بھی ناکام ہو کر بند ہو گیا۔

پندرہ ہزار کا نقصان

اس کثیر نقصان کا گاندھی جی کو بہت احساس ہوُا۔ اس لئے کہ وہ رقم ان کی ذاتی نہیں تھی اور گمان تھا کہ موکل گاندھی جی پر کوئی شبہ نہ کرے۔ مگر گاندھی جی نے بڑی کوشش اور سخت جانفشانی کے بعد امانت کی اس رقم کو پورا کیا اور موکل کا نقصان نہ ہونے دیا۔ اگرچہ تمام دوستوں اور خود موکل نے گاندھی جی کو ایسا کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ روپیہ میرے پاس امانت تھا۔ اور امانت کی اہمیت کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ اس لئے کسی کی خوش عقیدگی سے اس طرح فائدہ اٹھانا میرے لئے جائز نہیں ہے۔ ناظرین اس واقعہ سے گاندھی جی کے ضمیر کی مضبوطی کا اچھی طرح احساس کر سکتے ہیں۔ خصوصاً ان ہندوستانی مسلمانوں کو اس عبرت انگیز واقعہ سے ضرور سبق لینا چاہئے جو اپنے کو ایک امین پیغمبر کی امت سمجھتے ہیں مگر امانت کے معاملہ میں انہیں اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں رہا ہے۔

لیڈری کی دھاک

اسی زمانہ میں گاندھی جی نے جوہانسبرگ کے کمشنر پولیس سے مل کر ہندوستانیوں پر سے وہ پابندی دور کرائی جو ان پر داخلہ ٹرانسوال کے سلسلہ میں بہت دن سے عائد تھی اور جس کی رو سے وہ بغیر پروانہ کے ٹرانسوال میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس واقعہ سے گاندھی جی کی ہر دلعزیزی بہت بڑھ گئی۔ اور ان کی لیڈری پر بھی اس کا نمایاں اثر ہوُا۔ آمدنی بھی خاصی بڑھ گئی۔

اخبار نکالا

جوہانسبرگ کے قیام میں پبلک ضروریات کے لئے گاندھی جی کو ایک اخبار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء میں ایک ہفتہ وار اخبار انڈین اوپنین کے نام سے نکالا یہ شروع میں انگریزی۔ گجراتی

ہندی اور تامل (چار زبانوں) میں شائع ہوتا تھا مگر بعد کو تامل اور ہندی دو زبانیں کر دی گئیں اور صرف انگریزی اور گجراتی میں شائع ہونے لگا۔ اور اب تک انہی دو زبانوں میں ہفتہ وار شائع ہو رہا ہے۔

ایک مرتبہ اس اخبار کے سلسلہ میں گاندھی جی کو بہت پریشانی ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس اخبار کا دفتر جوہانسبرگ سے تبدیل کر کے دوسری جگہ لایا گیا۔ مشین وغیرہ نصب کرنے میں کچھ دیر ہو گئی اور انجنیئر کی غلطی سے اُس میں کوئی خرابی ہو گئی جس کی وجہ سے آئندہ پرچہ شائع کرنے میں خود گاندھی جی اور دوسرے ملازموں نے تمام رات مشین کو ہاتھ سے چلایا۔ مگر پرچہ اگلے دن وقت پر شائع کیا۔

طاعون اسی سال ٹرنسوال میں طاعون پھیلا۔ اور گاندھی جی نے بڑی دلیری کے ساتھ پبلک کی تیمارداری کی۔ اُس وقت جب ڈاکٹر بھی مریض کے پاس جانے جی چراتے تھے۔ خود گاندھی جی تمام شہر میں پھر کر مریضوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ اس وبا نے تمام شہر کو اجاڑ دیا اور لوگ دور دور جنگلوں میں خیمہ لگا کر بس گئے۔ اور چونکہ خیموں میں حفاظت کا کوئی مضبوط ذریعہ نہیں تھا اس واسطے گاندھی جی کو اس زمانہ میں ایک نئی شکل کا سامان ہوا۔ غریب لوگوں نے اپنا روپیہ پیسہ گاندھی جی کے پاس امانت رکھوا دیا۔ یہ امانتیں اس کثرت سے گاندھی جی کے پاس آئیں کہ انہیں مجبوراً اس کام کیلئے ایک دفتر بنانا پڑا۔ امانتوں کی مجموعی رقم تقریباً ساٹھ ہزار پونڈ یعنی نو لاکھ روپے کے قریب تھی۔ اب گاندھی جی کو یہ مشکل پیش آئی کہ اتنی بڑی رقم جس میں تانبے اور چاندی کے بے شمار سکے شامل تھے کوئی بنک لینے پر راضی نہیں تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بنک والے طاعون زدہ علاقہ سے آئے ہوئے سامان کو ہاتھ لگانا خطرناک سمجھتے تھے۔ مگر گاندھی جی کی کوشش سے ایک بنک راضی ہو گیا۔ اور

گاندھی جی نے ہر شخص کی امانت اُسی کے نام سے بنک میں جمع کر کے کتابیں حاصل کر لیں اور لوگوں کو بنک کے فائدے سمجھا کر بنک میں روپیہ رکھنے کا عادی بنا دیا۔

خود گاندھی جی بھی اسی زمانہ میں ٹرانسوال سے ترک سکونت کر کے ناٹال آئے اور ڈربن کے ایک سادہ مکان میں بود و باش اختیار کر لی۔

نئی بستی ڈربن پہونچکر گاندھی جی کو شہری زندگی کے مقابلہ میں دیہاتی زندگی اختیار کرنے اور دیہاتی زندگی کے فوائد کا احساس ہوا چنانچہ اپنے سب ساتھیوں سے مشورہ کر کے انہوں نے ڈربن شہر سے چودہ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا میدان خرید لیا اور وہاں عارضی جھونپڑیاں بنالیں۔ جہاں رفتہ رفتہ گاندھی جی کے بہت سے ساتھی پہونچ گئے۔ اخبار انڈین اوپینین کا دفتر بھی یہاں آگیا اور اس طرح اس نئی بستی کی بنیاد پڑی جو آج فینکس کے نام سے مشہور ہے۔ اخبار مذکور آجکل اسی بستی سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ اس بستی کی ابتدائی تیاری پر تقریباً پندرہ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔

اس عرصہ میں گاندھی جی نے اپنے بیوی بچوں کو بھی ہندوستان سے بلا لیا تھا۔ کیونکہ وہ اُن سے ایک سال کی واپسی کا وعدہ کر کے افریقہ آئے تھے۔ مگر فی الحال واپسی کی کوئی امید نہیں تھی اس لئے انہوں نے بیوی بچوں کو بھی اپنے پاس ہی بلا لیا فینکس پہونچکر گاندھی جی کے بیوی بچے بھی دیہاتی زندگی میں مگن رہنے لگے۔ اپنے گھر کے لئے گاندھی جی نے ایک چکّی بھی خرید لی۔ اور اس طرح سارے گھر کی ورزش کا انتظام بھی ہو گیا۔ خود گاندھی جی بھی اکثر چکّی چلاتے تھے۔

اسی زمانہ میں گاندھی جی کی ملاقات جوہانسبرگ کے مشہور اخبار کریٹک کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مسٹر پولک سے بھی ہو گئی۔ ان کی بیوی بھی یوروپین تھیں۔ یہ دونوں میاں بیوی گاندھی جی کی سادہ زندگی پر ریجھ گئے اور آخرکار یہ دونوں فینکس میں گاندھی جی کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ یہ انگریز خاتون (مسز پولک) بھی چکّی چلاتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں

گاندھی جی کے بچے بھی چکی کے مشغلہ میں خوب دلچسپی لیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد چند مجبوریوں کے باعث گاندھی جی نے فینکس سے اپنی سکونت جوہانسبرگ میں تبدیل کر لی۔

زولو بغاوت

اسی سال یعنی ۱۹۰۵ء کے آخر میں ڈربن (نٹال) میں زولو قوم نے حکومت کیخلاف بغاوت شروع کر دی۔ گاندھی جی نے اس موقع پر انسانی خدمت کیلئے ایک انجمن بنائی اور زولو قوم کے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ یہ بغاوت عرصہ تک جاری رہی اور گاندھی جی اپنا سب کاروبار چھوڑ کر تیمارداریوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران میں گاندھی جی کو تجربہ ہوا کہ جو شخص بیوی بچوں کے جھگڑوں میں پھنسا ہوا ہو وہ قومی خدمت پورے انہماک کے ساتھ انجام نہیں دے سکتا۔

یہ عجیب خیال گاندھی جی کے دل کی گہرائیوں میں ۱۹۰۱ء سے آہستہ آہستہ پرورش پا رہا تھا مگر ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کی مصروفیتوں میں انہیں پوری طرح یقین ہو گیا کہ بیوی بچے خدمت قوم کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

برہمچاری بن گئے

چنانچہ انہوں نے خوب غور و خوض اور احباب سے مشورہ کے بعد بیوی سے ہی اپنے برہمچاری[1] ہو جانے کا خیال ظاہر کیا۔ کستورابائی نے بڑی فراخ دلی اور خوشی کے ساتھ اسکی اجازت دیدی۔ چنانچہ گاندھی جی نے ۱۹۰۶ء کے وسط میں آئندہ برہمچاری رہنے کا عہد کر لیا جس پر وہ آج تک قائم ہیں۔ اور ۱۹۰۶ء کے بعد سے آج تک گاندھی جی نے برہمچاریہ کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ اس کے بعد سے کستورابائی علیحدہ کمرہ میں سونے لگیں۔ اور انہیں یہ بات کبھی ناگوار نہیں ہوئی۔

لندن میں

۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۳ء تک گاندھی جی کی زندگی اعتدال کے ساتھ گزرتی رہی اور اس آٹھ سال کے عرصہ میں اگرچہ ان کی سیاسی مصروفیت قائم

---

[1] صحت ماب۔ برہمچاری بننے کے لئے تمام جسمانی لذتوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً عورت سے جماع قطعی حرام سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ بیوی ہی کیوں نہ ہو۔

رہی مگر اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس کا تعلق عوام کی دلچسپی سے ہو۔ البتہ ۱۹۱۴ء کے بعد جب جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ ختم ہو گئی تو گاندھی جی ہندوستانی احباب کے اصرار پر جنوبی افریقہ کا قیام چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانہ میں سٹر گوکھلے انگلستان میں بغرض علاج مقیم تھے۔ چنانچہ انہوں نے گاندھی جی کو لکھا کہ مجھ سے لندن میں ملنے کے بعد ہندوستان جانا اس وجہ سے گاندھی جی معہ بال بچوں کے لندن کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہ سفر بھی جہاز کے تھرڈ کلاس میں کیا گیا۔ ۶ر اگست ۱۹۱۴ء کو یہ قافلہ لندن پہونچا۔

جنگ عظیم

گاندھی جی کے لندن پہونچنے سے دو دن پہلے ہی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اور انگریز حکومت اس زمانہ میں بہت پریشان تھی۔ گاندھی جی نے بحیثیت برٹش رعایا کے اپنے لئے انگریزوں کی امداد فرض سمجھکر احباب سے اس معاملہ میں مشورہ کیا مگر سب دوستوں نے رائے دی کہ ہم ہندوستانیوں کو اس جنگ سے بالکل علیحدہ رہنا چاہئے۔ گاندھی جی نے اس مشورہ کو تعصب پر مبنی سمجھتے ہوئے حکومت کی امداد کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ اور اس سلسلہ میں حکام سے مل کر اجازت حاصل کر لی مگر اب سوال یہ تھا کہ امداد کا طریقہ کیا ہو۔

انہی زمانہ میں مسز سروجنی نائیڈو بھی لندن میں مقیم تھیں اور وہ جنگ کے سپاہیوں کی وردی سینے اور سلوانے کی خدمت میں حکومت کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ گاندھی جی ان سے ملے۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ مسز سروجنی نائیڈو نے مشورہ دیا کہ آپکو بھی وردیاں تیار کرانے میں میرا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ گاندھی جی نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور چل پھر کے وردیاں تیار کرائیں۔ اسکے بعد جنگ سے آئے ہوئے زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام بھی گاندھی جی نے بہت کوشش اور محنت سے کیا۔ مگر اس زبردست محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود گاندھی جی سخت بیمار ہو گئے۔ یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ انکی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ ڈاکٹر مہتہ نے فوراً ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا۔

ہندوستان کو واپسی اگرچہ گاندھی جی ایسے آڑے وقت میں انگریزوں کی خدمت کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے اور کسی طرح آنے کیلئے تیار نہ تھے لیکن ڈاکٹروں اور دوسرے دوستوں کے اصرار پر آخرکار ایک ان ڈاکٹروں کی سفری ہدایات لیکر ہندوستان کے لئے روانہ ہوگئے۔

وطن کی مصروفیات بمبئی میں گاندھی جی کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ کچھ دن بمبئی میں ٹھہر کر گاندھی جی اپنے وطن راجکوٹ پہونچے۔ اور عرصہ کے بعد بھائی اور ان کے بال بچوں سے ملے۔ اس کے بعد محض تجربہ اور عوام کی مشکلات کا اندازہ کرنے کے لئے گاندھی جی نے ہندوستان کے اکثر شہروں کا دورہ کیا۔

اس عرصہ میں مسٹر گوکھلے بھی انگلستان سے پونہ واپس آگئے اور ۱۹۱۵ء کے شروع میں یکایک ان کا انتقال ہوگیا۔ گوکھلے کے انتقال سے گاندھی جی کی مصروفیات میں ایک اضافہ اور ہوگیا۔ کیونکہ اب انہیں سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کیلئے بھی کام کرنا پڑا۔ جو مسٹر گوکھلے کی نگرانی میں بہت شاندار خدمات انجام دے رہی تھی۔

اسی سال گاندھی جی نے کلکتہ اور رنگون کا سفر بھی کیا اور اس طرح بنگال اور برما کے باشندوں سے میل جول بڑھ گیا۔ واپسی پر گاندھی جی نے کمبھ کے میلہ کی سیر کا ارادہ کیا۔ یہ میلہ ہردوار میں ۱۲ سال کے بعد ہوا کرتا ہے اور لاکھوں سادھو اس میں شریک ہوتے ہیں۔

دوزخ کا مزا کلکتہ سے ہردوار تک کے سفر میں گاندھی جی کو روح فرسا تکالیف پیش آئیں کیونکہ یہ سفر بھی انہوں نے تھرڈ کلاس میں کیا تھا۔ گاندھی جی نے اس دردناک حالت کا جو سفر میں پیش آئی۔ حسب ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا۔

"کلکتہ سے ہردوار تک ریل کے سفر میں بے حد تکلیف ہوئی بعض جگہ ڈبوں میں روشنی تک نہ تھی۔ سہارنپور سے ہم لوگ مال گاڑیوں اور مویشی کے ڈبوں میں بھر دئے گئے۔ ان میں چھت نہیں تھی۔ دوپہر کو ایک تو سورج

کی گرمی دوسرے لوہے کے فرش کی تپش نے ہمیں بھون ڈالا۔ لوگوں کا یہ حال تھا کہ اس مصیبت کے سفر میں پیاس سے تڑپتے تھے لیکن اگر کسی اسٹیشن پر "مسلمان پانی" ملتا تھا تو نہیں پیتے تھے۔ اور ہندو پانی کے انتظار میں رہتے تھے۔ یہ یاد رہے کہ یہی ہندو جب بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کی تجویز سے بے تکلف انڈے پیتے گچھے شراب یا گائے کے گوشت کی یخنی چڑھا جاتے ہیں۔ اور مسلمان یا عیسائی کمپونڈر کے ہاتھ کا پانی پی لیتے ہیں"۔

گاندھی جی کو اس سفر میں اگرچہ ناقابل برداشت تکالیف اٹھانا پڑیں مگر انہوں نے تھرڈ کلاس کے سفر کو نہیں چھوڑا۔ ان کا خیال تھا کہ ان غریبوں کی مشکلات کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ وہ انہی میں گھس بیٹھ کر حالات اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور اس میں گاندھی جی کو آسانی یہ تھی کہ عام طور پر لوگ انہیں پہچانتے نہ تھے۔ حالانکہ گاندھی نام ان کے کانوں میں پڑ چکا تھا۔ گاندھی جی کو اس صورت ناشناسی سے اپنے کام میں بہت مدد ملی۔ ورنہ لوگ اگر انہیں پہچان لیتے تو تجربہ کا موقع نہ ملتا۔

احمد آباد میں مستقل قیام

ہردوار سے واپسی پر گاندھی جی نے آئندہ زندگی کیلئے احمد آباد کا انتخاب کیا چنانچہ وہاں ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء کو ایک آشرم کی بنا پڑی جو اب ستیاگرہ آشرم کے نام سے مشہور ہے۔ اس آشرم کی ابتداء میں تقریباً پچیس آدمی اس میں آکر مقیم ہوئے۔ اس کے بعد اچھوتوں کا ایک خاندان بھی آکر اس آشرم میں آباد ہو گیا۔ آشرم کے رہنے والے ہر ذات کے آدمی ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھاتے تھے اور آشرم کی چاردیواری میں چھوت چھات کی کوئی قید نہیں تھی۔ یہ حالات دیکھ کر مالک جائداد نے آشرم کے رہنے والوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیں۔ انہیں خوب گالیاں دیں مگر آشرم والے گاندھی جی کے زیر تعلیم تھے سب نے صبر سے گالیاں بھی سنیں اور سختیاں بھی برداشت کیں۔ مگر مالک جائداد کے

ظلم میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور سر آشرم کے اخراجات کی زیادتی سے اس کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ گاندھی جی اس کیفیت سے بہت پریشان ہوئے۔ مگر خدا کی قدرت کہ عین وقت پر ایک اللہ کا بندہ آشرم پہونچا اور اس نے گاندھی جی کے سامنے تیرہ ہزار روپے کی تھیلیاں رکھ کر درخواست کی کہ میری طرف سے یہ آشرم پر خرچ کر دیجئے۔ گاندھی جی اس غیبی امداد سے بہت خوش ہوئے اور اس رقم سے انہوں نے احمد آباد سے کچھ دور ایک عمارت تعمیر کرائی جہاں آشرم کے رہنے والوں کو منتقل کر دیا اس کے بعد بھی اکثر آشرم والوں کو مالی امداد ملتی رہی۔

اسی سال گاندھی جی کو خبر ملی کہ جنوبی افریقہ والوں پر حکومت افریقہ نے جتنی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں سب اٹھالی گئیں۔ اس خبر سے گاندھی جی کو بہت مسرت ہوئی۔ ان کی برسوں کی محنت اور کوششوں کا پھل مل گیا۔

چمپارن میں قیام احمد آباد کے زمانہ میں گاندھی جی کو چمپارن کے مصیبت زدہ کسانوں کے حالات کا علم ہوا۔ جو بیچارے وہاں کے چند تجارتی اداروں کے ہاتھوں بری طرح مبتلائے آلام تھے اور جنکی طرف سے گورنمنٹ بہار بھی لاپروائی برت رہی تھی ان مصیبت کے مارے کسانوں کی امداد کیلئے گاندھی جی چمپارن پہونچے جہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ کسان بڑے سخت شکنجوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور انہیں مشکلات سے نکالنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ گاندھی جی عرصہ تک چمپارن اور اس کے دیہات میں دورہ کرتے رہے۔ اس عرصہ میں گکی بیوی کستوربا جی دیہاتی عورتوں میں اصلاح کا کام کرنے کے لئے چمپارن آنا پڑا۔ گاندھی جی اور ان کے سب رفیق کار لوگوں نے مل کر چمپارن میں ایک اصلاحی مدرسہ بھی قائم کیا جہاں کستورا بائی بھی معلمہ کے فرائض انجام دیتی رہیں رفتہ رفتہ چمپارن کے کسانوں کی حالت سدھرنے لگی۔ اور یہ لوگ احمد آباد واپس آگئے۔

احمد آباد میں احمد آباد پہنچتے ہی گاندھی جی کو معلوم ہوا کہ مقامی ملوں کے مزدوروں نے شرح اجرت کی کمی کے باعث ہڑتال کر دی ہے اور مالکوں سے جھگڑا ہو گیا ہے چنانچہ گاندھی جی نے کوشش کر کے اکیس روز کے بعد مزدوروں سے مالکان مل کا سمجھوتہ کرا دیا۔

چمپارن سے واپسی کے بعد گاندھی جی کو آشرم میں کچھ ترقی نظر آئی۔ پہلے اس میں پچیس سے زیادہ آدمی نہ تھے مگر اب یہاں کے باشندوں کی تعداد چالیس کے قریب پہونچ گئی تھی۔ گاندھی جی نے ان سب کو ہنر سکھانے کا بندوبست کر دیا اور سب سے پہلے کپڑا بننے اور سوت کاتنے کا کام شروع ہوا۔

وار کانفرنس اسی سال گاندھی جی وائسرائے ہند کی دعوت پر وار کانفرنس دہلی میں شریک ہوئے اس زمانہ میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی سیاسی قید میں تھے۔ گاندھی جی نے علی برادران کی عدم موجودگی کو بُرا محسوس کرکے وائسرائے سے اس کی شکایت کی کہ ایسے نازک موقع پر ملک کے بڑے بڑے لیڈروں کو جیل میں رکھنا مناسب نہیں۔ وائسرائے نے اپنے یورپین کانوں سے اس شکایت کو توجہ کے ساتھ سن لیا۔ لو بس۔ وار کانفرنس کی شرکت کے بعد گاندھی جی نے جنگ عظیم کیلئے ہندوستان سے لاتعداد رنگروٹ بھرتی کرکے لڑائی پر بھیجے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس وفاداری کے عوض گورنمنٹ ہندوستانی رعایا پر مہربان ہو جائے گی۔ مگر...... نتیجہ......

خلافت اور ترک موالات جنگ عظیم ختم ہوئی۔ ہندوستان میں ہر طرف انگریزوں کی فتح پر خوشیاں منائی گئیں۔ مگر بدنصیب رعایا پر گورنمنٹ ہند کی نظریں زیادہ مہربان نہ ہو سکیں بلکہ ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل اسمبلی میں پیش کر دیا گیا جس کے خلاف گاندھی جی اور تمام ہندوستانی لیڈروں نے اس شدت کے ساتھ کام کیا کہ ہندوستان کی سرزمین لرز اٹھی۔ ستیہ گرہ کا عام دورہ ہو گیا ہزارہا آدمی جیلوں میں بھر گئے۔ تمام لیڈر بھی قید ہو گئے۔ پنجاب میں مارشل لا ء جاری ہوا اور پنجاب کے تاریخی گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے پنجاب میں وہ تہلکہ خیز گورنری کی کہ انگریز گورنمنٹ کو ہندوستانی تاریخ میں ہیرو کا پارٹ مل گیا۔ اس زمانہ میں گاندھی جی اور ان کے رفیقوں کی قربانیاں پورے عروج پر تھیں۔ خدا خدا کرکے پنجابی کارناموں کا ڈراپ سین ہوا۔ اور بعد میں لیڈران ملک کی تحقیقات پر ان مظالم کی رپورٹ شائع ہوئی تو ہندوستانیوں کے دل لرز اٹھے حالات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے اسی سال انگریزی اخبار ینگ انڈیا اور گجراتی رسالہ نوجیون اپنے انتظام میں لے لیا۔ اور اب یہ دونوں ہفتہ وار اخبارات ہیں جن کے ذریعہ

گاندھی جی اپنے خیالات ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے خلافت اور ترک موالات کے سلسلہ میں نہایت شاندار خدمات انجام دیں جن کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں میں بھی گاندھی جی کی وقعت بہت بڑھ گئی اور لوگوں نے انہیں مہاتما کا خطاب دیا۔ مہاتما گاندھی کے دل میں ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کی آرزو رہی ہے اور وہ آج تک اسی کوشش میں مصیبتیں جھیل رہے ہیں کہ کسی طرح ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ عام ہو جائے تاکہ سوراج اور آزادی سے قدیمی خواب کی تعبیر مل سکے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جب تک ہندوستان میں ہندو اور مسلمان ایک زبان اور ایک دل ہو کر کام نہیں کریں گے اُس وقت تک آزادی کی صورت دیکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مہاتما جی کا یہ پاک جذبہ یقیناً قابل قدر اور قابل تقلید ہے۔

زندہ باد مہاتما گاندھی

اور

زندہ باد ہندو مسلم اتحاد